قیمت: 10/- روپے

مارچ 2005

ماہ نامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محکمۂ ثانوی و اعلا تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

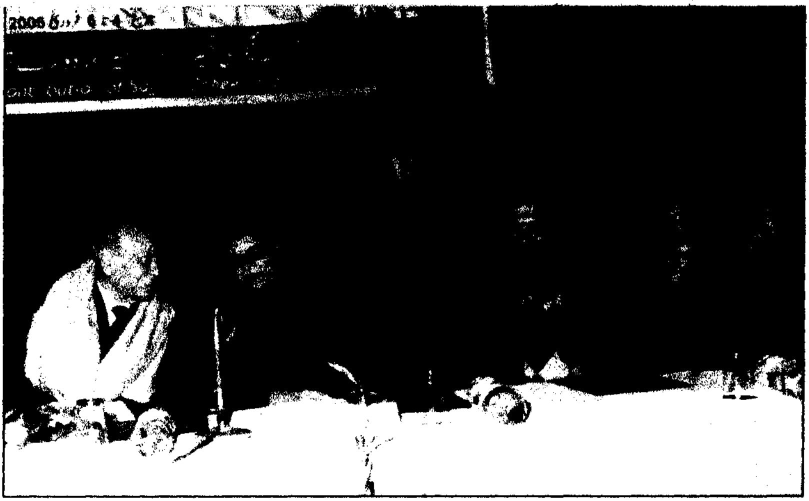

قومی اردو کونسل کی جانب سے بہ اشتراک انجمن ترقی پسند مصنفین 4 تا 6 فروری 2005 کے درمیان ایوان غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی میں "ہندستانی مشترکہ کلچر کی تعمیر: سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی خدمات" کے موضوع پر تین روزہ سمینار منعقد کیا گیا جس کا افتتاح مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے کیا اور اس افتتاحی تقریب کی صدارت ممتاز فلم اور تھیٹر آرٹسٹ جناب اے۔ کے ہنگل نے کی۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں (بائیں سے) جناب اے۔ کے ہنگل، جناب ارجن سنگھ، جناب سندیپ بنرجی اور پروفیسر نسیم اعلیٰ (وائس چانسلر جودھپور یونیورسٹی) کو دیکھا جا سکتا ہے۔

پروفیسر مشیر الحسن (وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) سمینار کی افتتاحی تقریب میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے۔
ساتھ میں (دائیں سے) جناب یوسف ٹینگ اور جناب عزیز برنی کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ماہ نامہ

اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔7، شمارہ۔3 مارچ 2005

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی واعلا تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی - 110 066
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746

شاخ: 110-7-22 قمر ڈفور، سالار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 6-1، چار کمان، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات ..... خطوط 2
ہماری بات ..... اداریہ 5
● جناب شمس الرحمٰن فاروقی قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین 6
● ادب، ادیب اور قاری: مابعد نظریات (گیسٹ کالم) ..... ریاض پنجابی 8
● رومن اردو کا ایک جامع نظام ..... سرور عالم راز 12
● اردو ذریعۂ تعلیم کی اہمیت اور ضرورت ..... محمد جہانگیر وارثی 20
● اردو صحافت: مسائل اور امکانات ..... عارف عزیز 22
● پہلو نرودا— شاعری کا پکاسو ..... مدن لال کپور 24
● پٹرول کو الوداع ..... جگدیپ سکسینہ 26
● سمندری لہروں سے توانائی کی فراہمی ..... محمد خلیل 29
● خوفناک سمندری لہریں ..... پربھات رنجن 30
● ہندستان اقتصادی سوپر پاور بنے گا ..... بھرت جھن جھن والا 32
اتہاس کے جھروکے سے:
● اشوک اعظم ..... مدن گوپال 34
گوشۂ ادب:
● ڈاکٹر تاثیر ..... ہری چند اختر 37
● تنویر احمد علوی سے گفتگو ..... اظہار احمد ندیم 39
گوشۂ فروغ کتب
● یاد رکھنا اور بھولنا (''ابتدائی نفسیات'' سے اقتباس) ..... سید محمد محسن 43
● ہند اسلامی سیاسی نظام— ایک تعارف
(''ہندستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا'' سے اقتباس) ..... ایچ. این. سنہا 48
طلبہ کے لیے
● ایئر کیبن میں روزگار کے مواقع ..... زبیر احمد بھاگلپوری 52
● پاور پوائنٹ کا تعارف ..... امت جین، سمراٹ شرما 54
● مختلف ممالک کی کرنسیاں (کوئز) ..... پرویز احمد اعظمی 56
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-20) ..... جاوید اقبال 59
اردو خبر نامہ ..... ادارہ 60
تبصرہ و تعارف ..... کتابوں پر تبصرے 71
● تنقیدی افکار/ شمس الرحمان فاروقی ..... مبصر: جاوید رحمانی
● دیوانِ درد/ ڈاکٹر نسیم احمد ..... مبصر: سراج نقوی
● اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم/ پروفیسر حنیف کیفی ..... مبصر: عبد الرب
● بہار نو بہار/ رفعت سروش ..... مبصر: ابوبکر عباد
● حسن نظر/ ورشن کپور فلک ..... مبصر: احمد کفیل
بچوں کا گوشہ
● پریشان کن داغ (''کسنی کی کہانیاں'' سے ایک کہانی) ..... سلطنی گووندن 77

آپ کی بات

■ **مظفر عازم، 2916 مورننگ گلوروڈ، منگٹن، ڈی۔اے۔ (USA)**

''اردو دنیا'' متواتر مل رہا ہے۔ عام قارئین سے لے کر بڑے ادیبوں تک سب پڑھنے والوں کے تعریفی خطوط کی کثرت رسالے کی اہمیت اور ادارے کے حسن عمل پر دال ہے۔ میں اس کو اپنے لیے دلچسپ بھی پاتا ہوں اور سودمند بھی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش زندگی کی علامت ہے۔ میری رائے ہے کہ رسالے میں چھپنے والے بیشتر مواد کے اہم اور قابل قدر ہونے کے پیش نظر متن کی صحت پر معمول سے زیادہ توجہ دینا ضروری ہے۔

شمس الرحمان فاروقی صاحب کا مضمون ''اکبر الہ آبادی: نئی تہذیبی ریاست اور بدلتے ہوئے اقدار'' دیگر خوبیوں کے علاوہ احتیاط اور عالمانہ دیانت داری اور عرق ریزی کی ایک اہم مثال اس لحاظ سے بھی ہے کہ بارہ تیرہ صفحات کے مضمون کے 72 حواشی ہیں۔ اب اس مضمون کا یہ جملہ پڑھیں (صفحہ 20)، ''کاپی نویس کے جرم میں مصنف بے چارہ ماخوذ ہوتا ہے۔'' عین اسی جملے کے لیے نمبر 40 کے ساتھ جو فٹ نوٹ چھپا ہے وہ اصل میں نمبر 41 کا ہے۔ اب یہاں جو ایک نمبر چھوٹ گیا تو بعد کے فٹ نوٹ غلط نمبروں کے ساتھ منسلک ہوتے گئے۔ اس طرح کا سہو مصنف سے ہویا'' کاپی نویس'' سے، محتاط پروف ریڈنگ سے اس کو بروقت درست کیا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں چھوٹی چھوٹی اور بھی کئی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ میں اس مسئلے کو زور دے کر اس لیے نمایاں کر رہا ہوں کہ میرے خیال میں ''اردو دنیا'' اس ضمن میں بھی رہنمایانہ کردار ادا کر سکتا ہے: ''ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔''

آپ نے پروفیسر شمس الرحمان فاروقی کے مضمون میں پروف کی چند

[illegible]

غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس کے لیے ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ آئندہ ایسی غلطیاں نہ ہوں۔ (ادارہ)

■ **ایس آئی ایچ کاظمی، سکریٹری انجمن فروغ اردو جموں و کشمیر، جموں، 3378، دلپتیاں۔ جموں-1**

''اردو دنیا'' کے دسمبر 2004 کے شمارے میں ''آپ کی بات'' کے تحت جناب رام پرکاش کپور کا خط اور آپ کا اداریہ قابل غور ہیں۔ آج کے اردو دشمن جو کہ اردو کے بارے میں کچھ جانے بوجھے بغیر تاریخ کی ناواقفیت کے سبب یا پھر اردو سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں، اگر تعصب کی عینک اُتار کر پڑھیں تو انھیں یہ جاننے میں کوئی دقت نہ ہوگی کہ وہ اپنی ہی تہذیب سے کتنے بے بہرہ ہیں۔ جناب رام پرکاش کپور کا خط ان کے لیے تازیانۂ عبرت ہونا چاہیے، اور آپ کا اداریہ ان کے لیے مشعل راہ۔

یہ دونوں تحریریں انجمن فروغ اردو جموں و کشمیر کی حالیہ میٹنگ میں پڑھی گئیں۔ تمام ممبران نے ان کی انتہائی تعریف کی اور یہ فیصلہ کیا کہ ایسے بہترین فرمودات چھاپنے پر آپ کو مبارکباد پیش کی جائے۔ یہ صرف اردو کے دشمنوں کے لیے ہی نہیں بلکہ اردو کی نئی نسل کے لیے جو اپنے سرمائے سے اچھی طرح واقف ہیں، فائدہ مند ثابت ہوسکتے ہیں بشرطیکہ ان سے استفادہ کرنے کی سعی کی جائے۔ خدا کرے آپ اسی طرح اردو کی خدمت میں لگے رہیں۔

■ **نوراللہ خاں فلاحی، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی**

''اردو دنیا'' جنوری 2005 کا شمارہ حسب سابق اپنی تمام تر رعنائیوں، رنگینیوں اور دلکش مضامین کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ بلاشبہ ایسے دور میں جبکہ ہر طرف

جنگِ آزادی میں ایک اہم رول ادا کرنے والی اردو زبان کی بدحالی نظر آتی ہے، یہ مجلہ اردو کے تئیں مختلف زاویوں سے اپنے دلفریب مضامین کے ذریعے ایک نمایاں کردار ادا کررہا ہے۔ اس کے علاوہ مفید و معلوماتی تبصرے، کیریئر گائیڈنس، انٹرویوز، سائنسی و غیر سائنسی اور دیگر اہم موضوعات مستقل کوئز وغیرہ رنگ برنگی خصوصیات کی بنا پر ''اردو دنیا'' کو تمام رسائل میں ایک انفرادیت حاصل ہے۔ یہ جریدہ عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کرتا جارہا ہے۔

■ ڈاکٹر م.ق.سلیم، سائبان، 19-2-469، بیرون فتح دروازہ، حیدرآباد

''اردو دنیا'' کا نئے سال کا شمارہ موصول ہوا۔ یہ پہلا رسالہ ہے جو کسی شخصیت کی وفات پر بہت کم عرصے میں اس کا گوشہ شائع کرتا ہے۔ اس سے مدیر رسالہ کی باخبری اور محنت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ 28/نومبر کو نثار احمد فاروقی اس دنیا سے چل بسے اور ایک ماہ سے بھی قلیل عرصے میں آپ نے گوشۂ نثار احمد فاروقی نکال کر ان کی خدمات کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ 13 صفحات میں آپ نے ان کی خدمات کی عکاسی کی ہے اور خود نثار احمد فاروقی کے مضامین شائع کر کے قاری کو انھیں ان کی تحریروں کے آئینے میں دیکھنے کا موقع دیا ہے۔ ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا'' کے مصداق جس پابندی سے یہ رسالہ نکل رہا ہے اس کا جواب نہیں۔ خاص طور پر اردو زبان و ادب کے لیے آپ کا تحقیقی کام ہے اور اس نوع کے مضامین اردو کے مستقبل کی عکاسی کرتے ہیں۔ آپ حال کے ساتھ اردو کے مستقبل کے لیے کوشش کررہے ہیں۔ حال ہی میں ایک رسالے کے مدیر نے لکھا تھا کہ اردو کو اگر ختم بھی کردیا جائے تو وہ کم از کم پچاس سال تک آسانی کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہے۔ اس کو ختم کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے مگر اپنے ہی جب بیگانے ہوجائیں تو کیا کیا جائے۔ قومی اردو کونسل اردو کو کمپیوٹر سے جوڑنے کی کوشش کررہی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہے۔ شہروں میں اردو میڈیم مدارس (مرکزی نصاب) بھی شروع کریں کیونکہ اردو کی ابتدائی تعلیم ہوگی تو اس کا مستقبل محفوظ رہے گا۔

■ سلیم قدوائی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز، نئی دہلی

''اردو دنیا'' کا فروری 2005 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ حسب معمول دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ تبصرہ و تعارف کے ذیل میں مبصر سراج نقوی صاحب نے ایک کتاب ''جدید سیاسی فکر'' پر تبصرہ کیا ہے۔ کتاب چونکہ میرے مضمون سے تعلق رکھتی ہے اس لیے میں نے غور سے پڑھا۔ تبصرے میں مبصر نے کتاب کا مصنف ڈاکٹر سید انوار الحق حقی کو بتایا ہے جبکہ یہ کتاب دو مصنفوں کی مشترکہ محنت کا نتیجہ ہے اور دوسرے مصنف ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود مبصر صاحب نے آخری پیراگراف میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ مذکورہ کتاب میں ''فاضل مصنفین (نہ کہ مصنف) نے بہت سہل اور سادہ انداز میں نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔'' یعنی موصوف نے کتاب کے ٹائٹل پیج اور پیش لفظ کو غور سے دیکھنے کی زحمت فرمائی ہے۔ اس کے باوجود دوسرے مصنف کو نظر انداز کرنا ناقابل فہم اور افسوسناک ہے۔

کتاب چونکہ قومی اردو کونسل نے شائع کی ہے اس لیے کونسل کے ترجمان میں ہی ایسی فاش غلطی خاص طور سے کھٹکتی ہے۔ ''اردو دنیا'' کے ایک مستقل قاری اور کونسل کے ایک خیرخواہ کی حیثیت سے اس فروگزاشت کی طرف توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

مبصر کے اس سہو کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے۔ (ادارہ)

■ شاہ عمران حسن، دلاور پور، کالی تعزیہ روڈ، ضلع مونگیر (بہار)-811201

میں مئی 2004 سے ''اردو دنیا'' کا مطالعہ کررہا ہوں۔ اس دوران اس رسالے سے میں نے کافی کچھ سیکھا ہے۔ 80 صفحات پر مشتمل آپ کا یہ رسالہ طبیعت خوش کردیتا ہے۔ ایک ساتھ اپنے اندر مختلف مشمولات کو سموئے ہوئے یہ رسالہ دن بدن نکھرتا ہی جارہا ہے۔ آپ اردو سے عدم دلچسپی کے دور میں اتنا معیاری رسالہ اور وہ بھی نہایت ہی کم قیمت پر پیش کررہے ہیں۔ یہ قارئین کے لیے ایک تحفہ ہی نہیں ادبی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ غرض یہ کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے بقول شاعر:

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

ستمبر 2004 کے ''اردو دنیا'' کے شمارے نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کردیا۔ یوں تو اس شمارے کے تمام مشمولات نہ صرف شاندار ہیں بلکہ جاندار بھی ہیں مگر مجھے بطور خاص آپ کا اداریہ، علامہ اقبال کے فرزند جاوید اقبال کا مضمون، خالد سعید اور چھما شرما کا مضمون دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ گوشۂ ادب کے تحت مرحوم پروفیسر جگن ناتھ آزاد پر رفعت سروش کا مضمون اور غضنفر سے لیا گیا انٹرویو بھی بہت معنی خیز ہے۔ جہاں رفعت سروش کا مضمون جگن ناتھ آزاد کی شخصیت کو گہرائی سے جاننے اور پہچاننے کا موقع دیتا ہے، وہیں غضنفر سے لیا گیا صفدر امام قادری کا انٹرویو بعض حقائق کا پردہ فاش کرتا ہے اور دعوت عمل بھی دیتا ہے۔ دیگر تخلیقات بھی قابل ستائش ہیں۔

■ ڈاکٹر شجاعت علی قادری، قادری منزل، نزد گیس گودام، غریب نواز کالونی، شہادہ، ضلع نندوربار (مہاراشٹر)

''اردو دنیا'' کئی ماہ سے پابندی کے ساتھ پڑھ رہا ہوں۔ شعبۂ ادارت کے سبھی احباب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اردو کے لیے ایک عمدہ اور معیاری رسالہ پابندی سے شائع کر رہے ہیں۔ عربی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے کونسل کا اقدام بھی قابلِ تحسین ہے۔ بہتر ہوگا کہ فارسی زبان کے لیے بھی کوئی مثبت قدم اٹھایا جائے تاکہ اہلِ اردو عربی اور فارسی سے بھی واقف ہو سکیں۔

اردو کی ترقی کے لیے ملک کے مختلف علاقوں کے افراد و ادارے اپنے اپنے انداز میں کام کر رہے ہیں، اگر ان کے طریقۂ کار و دیگر تفصیلات کے لیے ''اردو دنیا'' میں دو تین صفحات مختص کر دیے جائیں تو بہتر ہوگا۔ اس سے ان افراد و اداروں کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی اور دوسروں کو تحریک بھی ملے گی۔

"اردو دنیا" کے "اردو خبرنامہ" میں اردو سے متعلق تمام سرگرمیوں کا احاطہ کیا جاتا ہے جس میں مختلف افراد و ادارے بھی شامل ہیں۔ (ادارہ)

■ فیروز احمد فیض سکریٹری، محفظ المسلمین لائبریری، محسن پورہ، ٹیوب ویل، مئوناتھ بھنجن، ضلع مئو۔ (یوپی)

''اردو دنیا'' کا جنوری 2005 کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ محمود سعیدی صاحب کا مضمون ''پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ'' اور مظہر امام صاحب کا ''نثار احمد فاروقی: معتقدِ میر'' مجھے بہت پسند آئے۔ ان مضامین کے ذریعے نثار احمد فاروقی کو بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ سالِ گذشتہ جاتے جاتے ہمیں کئی مشہور و معروف شخصیتوں سے محروم کر گیا۔

آپ نے بالکل درست لکھا ہے کہ ''نثار احمد فاروقی صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں، کہنے کو یہ ایک عام سا جملہ ہے مگر اربابِ علم و دانش بخوبی جانتے ہیں کہ اس ایک جملے میں اردو ادب کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان پوشیدہ ہے۔''

■ ڈاکٹر آفاق فاخری، لیکچرر، اشرفیہ کالج، پوسٹ آفس مہول، ضلع اعظم گڑھ (یوپی)

''اردو دنیا'' پابندی سے مل رہا ہے۔ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے یہ رسالہ معیاری اور وقیع ہے۔ ہر شمارہ پُر از معلومات ہوتا ہے۔ سبھی مضامین دلکش اور لائقِ مطالعہ ہوتے ہیں۔ خصوصاً شمارہ جون 2004 میں گوشۂ ادب کے تحت شمس الرحمان فاروقی کا مضمون ''میرا ذہنی سفر'' اچھا لگا۔ آپ نے عبدالصمد سے گفتگو اور عرفان صدیقی پر ابرار رحمانی کا مضمون اور منتخب غزلیں بطور خراجِ عقیدت شریکِ اشاعت کر کے یقیناً رسالے کے ادبی وقار میں اضافہ کیا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے کارنامے سچ پوچھیے تو ہماری عصری اردو تاریخ کو ترتیب دے رہے ہیں جس کے نقوش ہمیشہ روشن رہیں گے۔

■ امجد جاوید، علیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) گلبرگہ

ستمبر کے ''اردو دنیا'' کا سرِ ورق دیکھ کر جی خوش ہوا۔ عظیم ہاشم پریم جی کی مسکراتی تصویر اور ان کا پُر معنی بیان جس کو ہماری نوجوان نسل کو بار بار پڑھنا چاہیے۔ مشمولات ہمیشہ کی طرح متنوع اور معلوماتی ہیں۔ خالد سعید کا مضمون ''ادبِ اطفال کی تدریس'' بہت معیاری ہے۔ اکبر الٰہ آبادی پر شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون اور دیویندر اسّر کا مضمون ''ترسیل و ابلاغ اور سماجی تبدیلی'' بہت اچھے اور معلوماتی مضامین ہیں۔ پورا شمارہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

■ نثار راہی، سکریٹری بزمِ اردو، جودھ پور (راجستھان)-342001

دسمبر 2004 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ جوگندر پال سے مکتی ورما کی گفتگو دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ ''اردو دنیا'' میں تاریخ، تعلیم، ادبِ اطفال، سائنس، کتب، تبصرے، خبریں غرض تمام شعبوں کے متعلق اچھا خاصا مواد مل جاتا ہے اور ان کے علاوہ ''اردو خبرنامہ'' کے ذریعے اردو ادب اور اردو دنیا میں ہونے والی ہلچل سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

■ ڈاکٹر عظیم امروہوی، دربار شاہ ولایت، امروہہ

''اردو دنیا'' اکثر زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔ اس کے علمی اور ادبی معیار کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

■ محمد معین الحق، ایڈووکیٹ اے پی پی، موتیہاری (بہار)

آپ کی جانب سے اردو زبان کے فروغ کے لیے جو اقدام اٹھائے گئے ہیں وہ بلاشبہ قابلِ تعریف ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آگے بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

■ محمد سمیع اللہ خاں بازیدی، اردو طلباء سوسائٹی بھونگہ، کرناٹک

''اردو دنیا'' جنوری کے سرِ ورق پر عظیم ادبی شخصیت نثار احمد فاروقی کی تصویر شائع کر کے آپ نے ہمیں غم میں مبتلا کر دیا۔ نثار احمد فاروقی کو مرحوم لکھتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے۔ اللہ پاک مرحوم کو جوارِ رحمت میں اعلا مقام عطا کرے اور متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اداریہ آپ نے خوب اور سچ تحریر کیا ہے۔

ہماری بات

ترقی پسند تحریک نہ صرف اردو کی سب سے بڑی ادبی تحریک تھی بلکہ اسے تمام ہندستانی زبانوں کی سب سے بڑی تحریک کہا جاسکتا ہے۔ فاشزم اور سامراج واد کے خلاف 1935 میں ہونے والی ادیبوں کی بین الاقوامی کانفرنس سے متاثر ہوکر سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے 1936 میں جس تحریک کی داغ بیل ڈالی اس کا مقصد نہ صرف ادب کو سماج کے کمزور اور دبے کچلے طبقوں کے مسائل کا آئینہ دار بنانا تھا بلکہ سماج کی فرسودہ روایات، فرقہ پرستی، ذات پات اور مذہبی کٹر پن کی مخالفت بھی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں جدوجہد آزادی اپنے شباب پر تھی اور ملک کا ہر شہری غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکنے کے لیے بیتاب تھا۔ ایسے میں ترقی پسند تحریک نے اس جذبے کو مزید تب و تاب عطا کی۔ اس تحریک کے روح رواں سید سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں ملک راج آنند، محمد دین تاثیر، جیوتی گھوش وغیرہ نے اپنی تحریروں کے ذریعے عوام میں انگریزی سامراج کے خلاف بیداری لانے کے ساتھ ساتھ براہ راست جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا۔ خاص طور سے سید سجاد ظہیر تو الہ آباد میں کانگریس کی سیاست میں کافی سرگرم تھے۔ بعد میں ان کی تمام تر توجہ ترقی پسند تحریک پر مرکوز ہوگئی اور اس کے ذریعے انھوں نے ایک غیر استحصالی، مبنی بر مساوات ہندستانی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کی کوشش میں اپنی پوری زندگی صرف کی۔ ہندستانی مشترکہ کلچر کی ترویج و استحکام میں نمایاں خدمات کے لیے سید سجاد ظہیر کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کے یوم پیدائش 5 نومبر 1905 کے اعتبار سے اس سال ان کی پیدائش کے سو سال پورے ہورہے ہیں اور اس موقعے پر پورے ملک میں سید سجاد ظہیر صدی تقریبات منائی جارہی ہیں۔

اسی سلسلے میں گزشتہ 4 تا 6 فروری 2005 کے درمیان قومی اردو کونسل نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے اشتراک سے ایک تین روزہ سمینار بعنوان ''مشترکہ ہندستانی کلچر کی تعمیر: سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی خدمات'' غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقد کیا۔ اس سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے بڑی اہم بات کہی کہ کمزور اور محروم لوگوں کی آواز عوام تک پہنچانے کی جو جدوجہد سید سجاد ظہیر نے شروع کی تھی اسے آج بھی جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح مختلف دشواریوں کے باوجود انھوں نے مشترکہ تہذیب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا، اسی طرح آج کی نوجوان نسل کو بھی عصر حاضر کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ایک ایسے وقت میں جب رجعت پسند طاقتیں ترقی پسند طاقتوں سے نبرد آزما ہیں، جناب ارجن سنگھ کا یہ بیان بے حد بامعنی اور توجہ طلب ہے۔

سمینار کے بقیہ اجلاسوں میں شرکا نے اس بات پر غور کیا کہ موجودہ دور میں ملکی اور عالمی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں، اس منظرنامے میں ترقی پسند تحریک کا کیا رول ہوسکتا ہے۔ مقررین کا خیال تھا کہ 1936 میں دنیا فاشزم اور سامراج واد کے خوف کے سائے میں جی رہی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہر جگہ افراتفری کا دور دورہ تھا اور دوسری عالمی جنگ کا خطرہ فضا میں منڈلا رہا تھا، ایسے میں پوری دنیا کے ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں نے فاشزم، سامراج واد اور جنگ کے خلاف عوامی رائے عامہ ہموار کرنے اور ممکنہ تباہی سے دنیا کو بچانے کی کوشش کی۔ آج حالات دوسرے ہیں۔ آج یک قطبی دنیا میں کمزور ممالک کا وجود خطرے میں ہے۔ قومی سطح پر فرقہ واریت، مذہبی منافرت اور ذات پات جیسے مسائل ہمارے لیے بڑا چیلنج ہیں۔ آج مذہب کی بنیاد پر انسان کو تقسیم کرنے والی قوتوں کو کاؤنٹر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندستان کی عوامی وراثت سیکولرزم کے فروغ میں ترقی پسند تحریک کا اہم کردار رہا ہے اور آج بھی اس کے بینر تلے یہ کام کیا جاسکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئے عالمی تناظر کو مدنظر رکھتے ہوئے ترقی پسند تحریک کا منشور تیار کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سے جوڑا جائے۔

سمینار میں کئی اہم سفارشات بھی پیش کی گئیں جن میں سے چند یہ ہیں:

- مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے کے مقصد سے اس طرح کے سمینار ہندستان کے مختلف شہروں میں منعقد کیے جائیں اور ترقی پسند ادبی تحریک کی خدمات پر روشنی ڈالی جائے۔ ان سمیناروں میں مقامی ادیبوں کو زیادہ سے زیادہ شریک کیا جائے۔
- ان رسائل اور جرائد سے روابط قائم کیے جائیں جو سجاد ظہیر کی خدمات اور ترقی پسند ادبی تحریک کے مختلف پہلوؤں پر خاص نمبر نکالنے کے لیے تیار ہوں اور ان رسائل و جرائد کے لیے مضامین اور دستاویزیں فراہم کرنے کی ذمے داری قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان لے۔
- سجاد ظہیر کی تخلیقات، مکتوبات اور مضامین کا مکمل مجموعہ شائع کیا جائے۔ اس کے لیے قومی کونسل سجاد ظہیر کے ورثا کو یہ یقین دلائے کہ کاپی رائٹ انھی کا رہے گا اور رائلٹی انھی کو ملے گی۔
- دہلی میں سجاد ظہیر کے نام سے موسوم ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جس میں ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ لوگوں کی تخلیقات، ادبی رسالوں کے فائل، انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنسوں کی دستاویزیں اور سارا متعلقہ مواد محفوظ کیا جائے۔
- واضح ترقی پسند رجحان رکھنے والے رسائل کو مالی امداد فراہم کی جائے تاکہ ان کا خسارہ کم ہو، اور وہ جاری رہ سکیں۔
- انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) جو لکھنؤ، الہ آباد، بھوپال، پٹنہ اور دوسرے شہروں میں سجاد ظہیر کا صد سالہ جشن منانے کا پروگرام بنا چکی ہے، اس کے لیے مناسب گرانٹ دی جائے۔
- کونسل ترقی پسند ادیبوں یا ترقی پسند رجحان رکھنے والی کتابیں خرید کر کتب خانوں کو مہیا کرے۔
- دانشگاہوں میں ترقی پسند ادب پر تحقیق کی حوصلہ افزائی کے لیے اسکالروں کو مناسب گرانٹ یا وظیفہ دیا جائے۔
- ممتاز ترقی پسند شاعروں اور فکشن نگاروں کے کلیات شائع کیے جائیں۔
- سمینار میں پڑھے جانے والے معیاری مضامین اور سجاد ظہیر کے ادب و افکار نیز تحریک پر لکھے ہوئے دیگر مضامین کونسل شائع کرے۔
- اردو کے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا انسائیکلوپیڈیا جو پروفیسر قمر رئیس مرتب کررہے ہیں، کونسل اس کی طباعت کے لیے مناسب امداد فراہم کرے۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین

مشہور و ممتاز، شاعر، ادیب اور نقاد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا نیا وائس چیئرمین مقرر کیا گیا ہے۔ اس خبر سے اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں مسرت کی نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ وہ ترقی اردو بیورو کے زمانے سے اس ادارے سے وابستہ رہے ہیں۔ کونسل کا ایجنڈا مرتب کرنے میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا پچھلے سات سال سے نمایاں رول رہا ہے۔

ان کی شخصیت اور کارناموں پر ہندستان اور پاکستان کے کئی اہم رسائل نے اپنے خصوصی نمبر شائع کیے ہیں اور دونوں ملکوں کے مختلف اداروں نے ان کی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ کونسل کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے ان کی کئی اہم کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے ''شعر شور انگیز'' (جس پر انھیں برلا فاؤنڈیشن کا سرسوتی سمان ملا ہے)، ''ساحری، شاہی، صاحب قرانی''، ''عروض، آہنگ اور بیان''، ''درسِ بلاغت'' اور ''تنقیدی افکار'' جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ''شعر، غیر شعر اور نثر''، ''افسانے کی حمایت میں''، ''تفہیم غالب''، ''اردو غزل کے اہم موڑ''، ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔ فاروقی صاحب ''شب خون'' جیسے رجحان ساز رسالے کے بانی مدیر بھی ہیں جو آج بھی ادب میں نئے میلانات کا سب سے بڑا نقیب ہے۔ اردو اور فارسی کے علاوہ انھیں کئی مغربی زبانوں خصوصاً انگریزی اور فرانسیسی پر بھی عبور حاصل ہے اور انھوں نے کئی اہم ترجمے بھی کیے ہیں۔

جناب فاروقی کی پیدائش 30 ستمبر 1935 کو پرتاپ گڑھ (یو پی) میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کوریا پار، اعظم گڑھ میں حاصل کی بعد ازاں گورکھپور سے گریجویشن اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم.اے. کیا۔ 1957 میں سول سروسیز کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے انڈین پوسٹل سروس جوائن کی اور 1994 میں حکومتِ ہند کے پوسٹل سروسیز بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔

جناب فاروقی ملک و بیرونِ ملک کی کئی یونیورسٹیوں میں وزٹنگ پروفیسر بھی رہے ہیں۔ انھیں برصغیر کے سب سے بڑے ادبی انعام سرسوتی سمان کے علاوہ ساہتیہ اکادمی انعام، دہلی اردو اکادمی کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، یوپی اردو اکادمی انعام، آل انڈیا میر اکادمی ایوارڈ، بنگال اردو اکادمی ایوارڈ کے علاوہ متعدد دیگر اعزازات سے سرفراز کیا جاچکا ہے۔ فاروقی صاحب نے امریکہ، برطانیہ، کناڈا، روس، خلیجی ممالک اور پاکستان میں بھی لیکچر دیے ہیں۔

14/فروری کو قومی اردو کونسل کے دفتر میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے فاروقی صاحب کا استقبال کرتے ہوئے انھیں گلدستہ پیش کیا۔ انھوں نے وائس چیئرمین کے طور پر جناب فاروقی کی تقرری پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا کہ جب سے قومی اردو کونسل کی تشکیل ہوئی ہے، ہمیں فاروقی صاحب کا مکمل تعاون حاصل رہا ہے۔ کونسل کے لیے فروغ اردو کی پالیسیوں اور ان کے نفاذ کا لائحہ عمل تیار کرنے میں فاروقی صاحب کا کلیدی رول

رہا ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی رہنمائی حاصل ہے۔

جناب فاروقی نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو سے محبت کرنے اور اس کے متعلق غلط خیالات کو رد کرنے کی تلقین کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا ادبی ورثہ دنیا کی عظیم زبانوں کے ہم پلّہ ہے۔ جو لوگ اردو رسم الخط میں اصلاح کی باتیں کرتے ہیں، انھیں شاید معلوم نہیں کہ دنیا کے ہر رسم الخط میں کمیاں ہیں۔ انگریزی میں "چ" لکھنے کے لیے تقریباً بارہ طریقے استعمال کیے جاتے ہیں، لیکن اس کے خلاف کوئی کچھ نہیں بولتا۔ ہمیں اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے تئیں مدافعانہ رویّہ اپنانا ترک کرنا ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ نستعلیق دنیا کے خوبصورت خطوں میں سے ایک ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے اس پروگرام میں کونسل کے جملہ اسٹاف نے شرکت کی۔

کونسل کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی تقرری پر دہلی کے ادیبوں اور صحافیوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی اگرچہ پیشے کے اعتبار سے ایک سینئر سول سرونٹ رہے ہیں لیکن ان کی اس سے بھی بڑی حیثیت یہ ہے کہ وہ اردو کے اعلا پائے کے نقاد، ادیب، محقق اور شاعر ہیں۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ تقریباً چالیس سال سے وہ ماہ نامہ 'شب خون' کے ایڈیٹر ہیں جو اردو میں اپنی طرز کا واحد ماہنامہ ہے۔ فاروقی صاحب نے اردو کی کئی نسلوں کی تربیت کی ہے۔ وہ تین سال تک ترقی اردو بیورو (موجودہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ اس لیے انھیں قومی اردو کونسل کا بہت اچھا تجربہ ہے۔ ادیبوں اور صحافیوں کی طرف سے جاری ہونے والے بیان میں امید ظاہر کی گئی ہے کہ فاروقی صاحب کی رہنمائی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کاموں میں مزید ترقی اور اضافہ ہوگا۔ بیان پر دستخط کرنے والوں میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (نائب صدر، انجمن ترقی اردو (ہند)، سید شریف الحسن نقوی، م۔ افضل (وائس چیئرمین، دہلی اردو اکادمی)، پروفیسر شمیم حنفی، خلیق انجم، اسلم پرویز (ایڈیٹر "اردو ادب")، شاہد علی خاں (جنرل منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، شاہد ماہلی (ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ)، منصور آغا (ڈپٹی چیف ایڈیٹر "قومی آواز")، محمد وسیم الحق (ایڈیٹر "اخبار مشرق")، عتیق مظفر پوری (ایڈیٹر "سائبان")، مودود صدیقی (اخبار نو)، مرغوب حیدر عابدی (سکریٹری دہلی اردو اکادمی)، عقیل احمد (سکریٹری غالب اکیڈمی) اور جاوید رحمانی شامل ہیں۔ دہلی کی ادبی ،ثقافتی اور سماجی تنظیم "میزان" کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے بھی پروفیسر فاروقی کے تقرر پر مسرت کا اظہار کیا ہے۔

فاروقی صاحب کے وائس چیئرمین نامزد کیے جانے کی خوشی میں نیشنل اردو رائٹرس ایسوسی ایشن الٰہ آباد کی طرف سے ایک تہنیتی نشست منعقد ہوئی جس میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو مبارکباد پیش کی گئی۔ اس نشست میں پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، ایم اے قدیر، اسرار گاندھی، عتیق الٰہ آبادی، خواجہ جاوید اختر، ڈاکٹر اسلم الٰہ آبادی، انعام حنفی، مہدی جعفر، فرخ جعفری، این اختر، نیر عاقل، قمرالحسن صدیقی، نصر قریشی نے شرکت کی۔

سنٹرل سوسائٹی فار ہیومن ہیلتھ کے زیر اہتمام ایک جلسہ ڈاکٹر قاضی کمال الدین احمد سبکدوش ڈائرکٹر میڈیکل اینڈ ہیلتھ کی صدارت میں ہوا جس میں مقررین نے کہا کہ فاروقی صاحب نے اردو زبان کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اب وہ نئی ذمے داریوں کے ساتھ اردو تعلیم کی ترویج میں نئی راہیں نکالنے میں معاون ہوں گے۔ جلسے میں حکیم عتیق نور، ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی، محمد ابوزمانی، حکیم احمد علی ، حکیم جلال الدین، حکیم ارشاد الاسلام، محمد سرفراز حسین، ڈاکٹر اشفاق حسین، پروفیسر سید مظہرالحق، غلام ربانی خاں ایڈووکیٹ، ظفر محمد کامل ایڈووکیٹ ، احمد طلحہ وغیرہ نے شرکت کی۔

کونسل کے وائس چیئرمین کے عہدے پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے تقرر سے فروغ اردو کی موجودہ پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے اس زبان کی ترقی کی نئی راہیں تلاش کرنے میں مدد ملے گی اور امید ہے کہ ان کی رہنمائی میں کونسل مزید جوش و جذبے کے ساتھ اردو زبان اور تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرنے میں کامیاب ہوگی۔

□□□

ریاض پنجابی

گیسٹ کالم

ادب، ادیب اور قاری: مابعد نظریات

عصرِ حاضر، عالمگیریت، تکنیکی انقلاب اور جمہوری اقدار کا عہد ہے۔ اس میں معاشی اور ثقافتی عالمگیریت اہم اور مخصوص اہداف کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ منڈیاں اور صارفین ان اہداف کے حصول میں مرکزی کرداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نظام میں "منافع" کو مرکزیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے اس نظام کے وضع کردہ اصول، حکمتِ عملی اور نئی اقدار، زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کو اولین حیثیت دیتے ہیں۔

دنیا کو ایک نئے دور میں دھکیلنے والی قوتوں کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ نئی معاشی اور ثقافتی عالمگیریت کا حصول، نیز عالمی منڈیوں کے فروغ اور نئی صارفی اقدار کی ترویج ایک عالمی نظام ترسیل و ابلاغ کے بغیر ناممکن ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے تجارتی طرز اور مارکیٹ کے اصولوں پر وضع کردہ ایک نئے عالمی نظام ترسیل و ابلاغ کی تشکیل، ایک ناگزیر عمل تھا۔ یہ نظام ترسیل و ابلاغ تشکیل اور فروغ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے اور عالمی سطح پر اپنے کاروبار میں مصروف ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات و پروگرام، انٹرنیٹ، جرائد، اخبارات اور کتابوں کی اشاعت اس عالمی نظام کی مکمل تحویل میں آ چکے ہیں۔

اس حالیہ صورت کے تناظر میں ادب، ادیب اور ان کے حوالے سے قاری کے بارے میں بھی کئی سوال ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اس نظام میں کس طرح کا ادب تخلیق ہوگا؟ کیا نظریہ، کسی بھی شکل میں، ادب کے دائرہ کار (domain) سے مکمل طور پر غائب ہو رہا ہے؟ یہ صورتِ حال ایک قاری پر کس طرح اثر انداز ہوگی؟ نئے نظام ترسیل و ابلاغ کا پس منظر اور پیش منظر ان سوالات کے جواب کا سراغ فراہم کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نظام کی ترکیبی ہیئت اور خصوصیات کا ایک مختصر جائزہ ضروری ہے۔ خیال رہے کہ اس نظام ترسیل و ابلاغ کے دائرہ کار میں ادبی اشاعتی کام بھی مکمل طور پر آ چکا ہے۔

نیا نظام ابلاغ، اولاً مملکتوں اور حکومتوں کی دخل اندازیوں کے دائرہ کار سے باہر آ چکا ہے۔ ثانیاً، یہ نظام، بڑے بڑے بین الاقوامی تجارتی اداروں کی مکمل گرفت میں ہے۔ یہ ادارے، عملی طور پر خودمختار بین الاقوامی اکائیوں کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ مملکتیں اور حکومتیں کسی مخصوص طرزِ فکر یا زاویۂ نظر کی تبلیغ و ترویج کے سلسلے میں ان اکائیوں پر اب کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتیں۔ اس کام کے لیے انھیں الگ سے خود اپنے انتظامات کرنے ہوں گے۔ مملکتوں اور حکومتوں کے پاس ان اکائیوں کے ساتھ تجارتی حکمتِ عملی کے تحت مقابلہ آرائی کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ حالات و واقعات کے پیشِ نظر بین الاقوامی تجارتی اداروں کا دائرہ کار ہر آنے والے دن کے ساتھ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہندستان میں سیاسی سطح پر شدید مخالفت کے باوجود، حکومت ان اداروں کی آمد اور اُن کی اقتصادی گرفت کے سلسلے کو روکنے میں ناکام ہوئی ہے۔ یہ ادارے، چھوٹے اور درمیانہ درجے کے تجارتی اداروں کو ہضم کر کے بڑے بڑے اداروں کو تشکیل دے رہے ہیں۔ امریکہ میں تعلیمی کتابوں کی اشاعت کا کاروبار دو دہائی قبل تقریباً دو درجن اداروں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ کاروبار اب صرف چار بین الاقوامی دیوہیکل تجارتی اداروں کے قبضے میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ سال 2000 کے اولین چھ مہینوں کے اندر اندر، اُن بڑے تجارتی اداروں اور درمیانہ درجے کی کمپنیوں کے مابین، جو ذرائع ترسیل و ابلاغ، مواصلات اور انٹرنیٹ کے کاروبار میں سرگرم تھے ایک دوسرے میں انضمام کے سلسلے میں تین ہزار لاکھ ڈالر کا لین دین ہوا۔ اس کے بعد بڑے بڑے بین الاقوامی تجارتی ادارے دنیا کے مختلف خطوں میں چھا گئے۔ روپرٹ مرڈوک کی نیوز کارپوریشن کا سٹیلائیٹ ٹیلی ویژن پورے ایشیا، یورپ اور لاطینی امریکہ کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے اسٹار ٹیلی ویژن سے ایشیا بھر میں تیس چینلوں کے ذریعے سات مختلف زبانوں میں پروگرام نشر ہوتے رہتے ہیں۔ مرڈوک، ٹیلی ویژن کے علاوہ سب سے بڑے عالمی اشاعتی ادارے، ہارپر کولنز (Harper Collins) کا بھی مالک ہے۔ اس کی کمپنی کتابوں اور جرائد کی اشاعت کے علاوہ ایک سو تیس روزنامے بھی شائع کر رہی ہے۔

مندرجہ بالا صورتِ حال کے پیشِ نظر ذہن میں یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ ان دوررس عالمی تبدیلیوں کے پیچھے کوئی مخصوص نظریہ کارفرما ہے یا نہیں۔ یہ تبدیلیاں کسی نئے اور ٹھوس معاشی، سیاسی یا ثقافتی نظریے کا نتیجہ ہیں یا یہ نئے عالمی نظام کے ظہور پذیر ہونے کا ایک منطقی نتیجہ ہیں۔ یہ سوالات غور طلب ہیں۔

(2)

مارکسی طرزِ فکر کا انحطاط سوویت روس کے انتشار کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ امریکہ کی سربراہی میں، ایک قطبی (Unipolar) دنیا کے ظہور میں آنے کے بعد، اشتراکی طرزِ خیال کی ہم نوا جماعتوں کو بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور بین الاقوامی رشتوں کے منظرنامے کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس طرزِ فکر کے شائقین اپنی فکری حیثیت و ترکیب میں موجودہ صورتِ حال کے تقاضوں کے پیشِ نظر ترمیمات و تبدیلیوں کے عمل میں مصروف ہیں۔ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ نیا عالمی معاشی نظام جو عالمی منڈیوں کے دم پر قائم ہے، دراصل نئے عالمی سرمایہ دارانہ معاشی نظام کا جزولاینفک ہے۔ اس پس منظر (مجبوری کی حالت) میں روایتی اشتراکی طرزِ فکر کے حامیوں کی کارکردگی کا دائرہ سکڑ رہا ہے۔ اب وہ اکثر و بیشتر سماجی انصاف، جمہوری اقدار اور حقوقِ انسانی کے محاذوں پر متحرک ہو رہے ہیں۔ اگرچہ ایک سطح پر روایتی مارکسی طرزِ فکر کے خدوخال معدوم ہوتے نظر آرہے ہیں۔ تاہم دوسری سطح پر اشتراکی طرزِ فکر، سوشلزم اور ترقی پسندی کے نام پر اپنے دائرۂ اثر کو متحرک اور فعال بنانے کی سعی میں مصروف ہے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ روایتی سرمایہ دارانہ نظام کی ہیئت و ترکیب بھی کافی حد تک بدل چکی ہے۔ اب مارکیٹ سرمایہ داری (Market Capitalism) کا زمانہ ہے۔ مارکیٹ سرمایہ داری کا مکمل انحصار مملکتوں پر نہیں، البتہ منڈیوں پر ہے۔ اس نظام کا مصرف منافع اور مزید منافع کا حصول ہے۔ یہ نظام، جس کو نو آزاد خیالی (NEO-liberalism) کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، کسی بھی طرح کی پابندی (Restrictions) کا روادار نہیں ہے۔ نئے عالمی ترسیل و ابلاغ میں، جو مارکیٹ سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ ہے، سیاسی موضوعات، بے لاگ تنقید اور اشتراکی طرزِ فکر سے جڑے خیالات و افکار کی بہت ہی کم گنجائش ہے۔ اس صورتِ حال سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عصرِ حاضر میں، عالمی سطح پر بالعموم اور امریکہ میں بالخصوص، روایتی نظریات، سیاسی اور سماجی منظرنامے سے غائب ہوچکے ہیں۔ سوویت روس کے انتشار کے بعد تجزیہ نگاروں نے اس تاریخ ساز واقعے (یا سانحے) کو تاریخ کے اختتامی باب (End of History) سے تعبیر کیا تھا۔ اس لحاظ سے اس واقعے کو نظریات کے اختتام سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

نظریات، روایتی اعتبار سے، عالمی منظرنامے سے ہٹ تو گئے ہیں۔ ان کی جگہ دوسری نوعیت کے طرزہائے فکر اس خلا کو پورا کرنے میں مستعدی کے ساتھ سرگرم ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور فعال امریکہ کی نوقدامت پسند (NEO-Conservative) طرزِ فکر ہے۔ جس کے حامی NEO-Cons کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اس وقت پوری قوت کے ساتھ سرگرم ہیں۔ یوں تو نوقدامت پسند، امریکہ میں سیاسی سطح پر پچھلی تین دہائیوں سے سرگرم عمل تھے۔ پچھلی زائد از ایک دہائی سے اندرون ملک امریکہ میں اور امریکی طرزِ عمل کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر اس طرزِ فکر کے حامی خاصے فعال اور متحرک رہے ہیں۔ ان کے اثر و رسوخ نے امریکی حکومت کے طرزِ عمل کے حوالے سے پوری دنیا کو ہر سطح پر متاثر کیا ہے۔ یہ عمل جوش و خروش کے ساتھ جاری ہے۔ امریکہ کے سابق صدر، بل کلنٹن نے Neo-Cons کے لائحۂ عمل کو ترمیمات کے ساتھ جزوی طور پر عمل میں ضرور لایا، تاہم امریکہ کے موجودہ صدر، جارج ڈبلیو بش کے اہم صلاح کار اسی لائحۂ عمل کو پوری طرح نافذالعمل کرنے میں خاصے سرگرم ہیں۔

امریکہ میں نوقدامت پسندی نے ایک رسمی اور ٹھوس سیاسی نظریے کی شکل اختیار نہیں کی ہے۔ البتہ اس طرزِ خیال کے خدوخال ایک جامع حکمتِ عملی کی شکل اختیار کرچکے ہیں۔ اس حکمتِ عملی کے علم برداروں کے مطابق امریکہ، سیاسی، معاشی، ثقافتی، فوجی اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے کرۂ ارض پر دو واحد ملک ہے، جس کی دھاک پورے عالم میں قائم و دائم کرنا امریکہ کا 'حق' ہے۔ اس کا یہ جواز پیش کیا جارہا ہے کہ امریکہ معاشی، فوجی اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے واحد عظیم اور طاقتور (Super Power) ملک ہے۔ اس طرزِ خیال کے مطابق طاقت (Power) کے رول اور امریکہ کی سلامتی کو دنیا کے ہر معاملے میں فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے جوزف نئی جونیئر (Joseph Nye Jr.) کے مطابق، طاقت کے رول اور سلامتی کی مرکزیت (امریکہ کے حوالے سے) کو نظرانداز کرنے کا مطلب آکسیجن کو نظرانداز کرنا ہے۔ یہ خیال رہے کہ جوزف نئی جو آج کل درس و تدریس سے وابستہ ہیں، بل کلنٹن انتظامیہ میں اسسٹنٹ ڈیفنس سکریٹری رہ چکے ہیں۔ یہ خیال درست نہیں ہے کہ نوقدامت پسند عیسائی اور یہودی ہی چھائے ہوئے ہیں۔ دراصل پچھلی کئی دہائیوں سے ہر طبقۂ فکر کے امریکی لوگ، جو کہ دائیں بائیں یا درمیانی سیاسی نظریات سے وابستہ تھے، نوقدامت پسندوں میں شامل ہوکر اس مخصوص طرزِ فکر کو تقویت دینے میں سرگرم رہے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ جارج ڈبلیو بش کی سربراہی میں موجودہ حکومت میں ان کے خیالات کو عملی طور پر روبہ عمل لانے کا سلسلہ خاصہ تیز ہوگیا ہے۔ گیارہ ستمبر کے دہشت گرد حملوں نے اس لائحۂ عمل کو مستحکم اور فعال بنانے میں ایک سنہری موقعہ فراہم کیا۔ پال وولف وز (Paul wolfwitz) اس طبقۂ فکر کے علم بردار کی

حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ وولف وز جو ایک اوسط درجے کے پروفیسر تھے، اب امریکہ کے موجودہ قومی سلامتی کے معاملوں میں خاصے بارسوخ مانے جاتے ہیں۔ ان کے بارسوخ ہونے میں اُن کے نوقدامت پسند خیالات و تصورات کا خاصا دخل ہے جن کی وہ جنون کی حد تک تبلیغ کرتے آئے ہیں۔ نوقدامت پسندوں کے احیا، مارکیٹ سرمایہ داری پر مبنی نئے معاشی نظام اور امریکہ کے عالمی بالادستی کے دعوے نے بین الاقوامی سیاست اور ثقافت کو بالعموم اور امریکہ کی سیاست و ثقافت کو بالخصوص خاصا متاثر کیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ امریکہ کے اندر ریپبلکن اور ڈیموکریٹس کے مابین سیاسی رسہ کشی میں بھی نوقدامت پسند تصورات حاوی رہے ہیں۔ ان تصورات کو ڈیموکریٹس بھی پوری طرح نظرانداز کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اس کی مثال ڈیموکریٹس میں صدارتی انتخاب کے لیے امیدواروں میں مقابلہ آرائی کے دوران جان کیری کی جیت ہے۔ انھوں نے ہاورڈ ڈین کو جو انتخابی اندازوں کے حقائق پہلے نمبر پر تھے، دوسرے نمبر پر دھکیل دیا۔ ہاورڈ ڈین نے، جو جنگی محاذ آرائیوں کے خلاف ہیں، جارج بش کے عراق پر حملے کی جم کر مخالفت کی تھی جب کہ جان کیری نے اس حملے کی حمایت کی تھی۔

نوقدامت پسندی کا کوئی مذہبی زاویہ (angle) بھی ہے یا یہ صرف ایک سیاسی حکمتِ عملی ہے جس میں مذہبی جذبات و خیالات کا کوئی عمل دخل نہیں ہے؟ یہ سوال دانشوروں اور تجزیہ نگاروں میں ایک مستقل موضوع بحث ہے۔ اس سلسلے میں پولینڈ کے ایک معروف دانشور، مارِیک گلوگوز وسکی (Marek Glogocz wski) کا ایک موثر اور دانشورانہ مضمون حال ہی میں ورلڈ افیئرز (World Aftairs) (دسمبر 2003) میں شائع ہوا ہے۔ مارِیک کے مطابق عیسائیت کی وہ روایت جو جان کے بیانیہ (Gosple of John) سے منسوب ہے، کے مطابق حضرت عیسیٰ کا مشن یہ ہے کہ دنیا میں صرف ایک ریوڑ اور صرف ایک گڈریا، (One flock, One Sheperd) کے اصول پر حکومت (عالمی سطح پر) قائم ہو۔ مارِیک عیسائیت کی تمام روایتوں، نیز قدیم و جدید صحیفوں (Old and New Testaments) کی تحقیق کے بعد، ایک گڈریا اور ایک ریوڑ، کے ہدف کو موجود امریکی سیاسی حالات پر منطبق کرکے یوں رقم طراز ہیں: ''نوقدامت پسند جو آج کل امریکہ میں برسرِ اقتدار ہیں، جارحانہ طور پر اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا بھر میں صرف، ایک گڈریا اور ایک ریوڑ ہو۔'' امریکہ کے مشہور و معروف دانشور، نوم چومسکی کا حوالہ دیتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں: ''فتوحات کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اس وقت تمام وہ اقوام، جو لارڈ کی نافرمانی کی حرکات کی مرتکب ہوں گی، نیست و نابود کردی جائیں گی۔ بالخصوص وہ اقوام، جو نادانستہ طور پر 'لارڈ' کے مدِمقابل 'اللہ' کی عبادت کریں گی۔''

مارِیک گلوگوز وسکی نوقدامت پسندوں کے ایجنڈے کا سائنسی انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کئی سال قبل پال وولف وز اور امریکی انتظامیہ کے چند مخصوص اراکین نے، نئی امریکی صدی کا ایک پروجیکٹ، (A Project for a New American Century) نام کی ایک دستاویز تیار کی تھی۔ اس میں یہ ہدایت دی گئی تھی کہ امریکہ اپنی فوجی طاقت کا یک طرفہ استعمال کرتے ہوئے مکمل عالمی بالادستی قائم کرے۔ دلچسپ (حیرت انگیز) بات یہ ہے کہ امریکی بالادستی قائم کرنے کے پروجیکٹ کا طریقہ بعینہ وہی ہے، جو صدیوں پہلے عیسائیوں نے سلطنتِ روم سے حکومت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔

نوقدامت پسندوں کی عالمی بالادستی اور ایک ریوڑ ایک گڈریا کا خواب ہنوز تشنۂ تعبیر ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ کیا یہ خواب امریکی عوام کا ایک مشترکہ خواب بھی ہے؟

(3)

دنیا بھر میں امریکہ کی عراق پر جارحیت کے خلاف جو مظاہرے ہوئے، ان میں سب سے موثر، منظم اور پرجوش مظاہرے امریکہ میں ہوئے۔ ان مظاہروں میں امریکہ کے ادیب، شاعر، دانشور، فلم اور تھیٹر کے مشہور اداکار اور نامور صحافی پیش پیش تھے۔ امریکہ کے ذرائع ابلاغ نے ان مظاہروں کی خوب تشہیر کی۔ امریکہ کے دانشوروں نے نوقدامت پسند ایجنڈے کو امریکی آئین اور مملکت کے بنیادی سیاسی اور سماجی اصولوں کے منافی قرار دیا۔ اس سے یہ بات عیاں ہوگئی ہے کہ نوقدامت پسندوں کی امریکی بالادستی اور جارحیت کا خواب امریکہ کے عوام کا مشترکہ خواب نہیں ہے۔ یہ اندازہ بھی غلط نہیں ہے کہ نوقدامت پسند فی الحال عوامی سطح پر غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ امریکہ میں سیاسی سطح پر آزاد خیال جمہوریت پسند (Liberal Democrats) نوقدامت پسندوں کے خلاف پوری طرح صف آرا ہیں۔

اقوام کے سیاسی اور سماجی شعور کی تشکیل میں ان حوادث کا خاصا اثر ہوتا ہے جن سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے۔ امریکی دانشوروں کے مطابق پرل ہاربر (Pearl Harbour)، جس میں جاپانی افواج نے امریکی بحری بیڑے کو اپنے اچانک حملوں کا نشانہ بنایا تھا، امریکہ کے اجتماعی سیاسی شعور کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اس کا اظہار قومی سلامتی و دفاعی پالیسیوں کے علاوہ کلچر کی سطح پر بھی ہوتا رہتا ہے۔ یہ اندازہ قبل از وقت ہے کہ گیارہ ستمبر کے دہشت

گردحملوں نے کس حد تک اور کس کس سطح پر امریکہ کے سیاسی اور سماجی شعور کو متاثر کیا ہے۔ تاہم ان حملوں کے بعد امریکہ اور یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ گیارہ ستمبر نے نوقدامت پسندوں اور اس طبقۂ فکر سے وابستہ دانشوروں کو اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بنانے کے لیے سنہری موقع فراہم کیا۔ اس سانحے کے بعد سیاسی اور دانشورانہ سطح پر اسلام اور مسلم مخالف عناصر کی باقاعدہ صف بندی بھی شروع ہوئی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امریکہ کے اپنے مضبوط سماجی اور ثقافتی اقدار کے باعث نظریہ عناصر، خلاف توقع عوامی سطح پر ہلچل پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ امریکہ کے جمہور پسند حلقے اور حقوق انسانی کی تنظیمیں مستعدی کے ساتھ نوقدامت پسندوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔

اس پس منظر میں خوشگوار حقیقت یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی ادیب اور ادب تا حال نوقدامت پسندی کے اثرات سے مبرّا نظر آتے ہیں۔ پچھلے ایک دو سال میں ناولوں، افسانوں اور شاعری کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے ادیب و شعرا، وجودی حقائق اور انسانی و سماجی مسائل و حالات کے دائروں کے اندر اندر اپنے تخلیقی سفر پر گامزن ہیں۔ اس سلسلے میں پیٹ ڈیکٹر (Pete Deocter) کے تازہ ناول "دی ٹرین" کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ اس ناول کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی اور یہ کافی مقبول بھی ہو رہا ہے۔ یہ ناول، جولاس اینجلس کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، نسل پرستی، نسلی تعصب اور امریکی سماج میں بڑھتے ہوئے تشدد کے رجحانات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ڈیکٹر کا ایک اور ناول The Paper Boy خاصی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اسی طرح، این ٹیلر (Aune Tyler) کے نئے ناول The Amateur Marriage کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوئی ہے۔ یہ ناول شادی کے بندھن میں بندھی دو متضاد شخصیات سے متعلق ہے، جو تضادات، ذہنی اور جذباتی دباؤ اور کشمکش کی زندگی گزارتے ہیں۔ ناول کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اولاد کے موجود ہونے کے باوجود، میاں بیوی، دونوں میں سے کوئی بھی پدرانہ یا مادرانہ رول ادا کرنے کو تیار نہیں۔ یہ المیہ مغربی سماج کی ایک عام کہانی ہے۔ مغرب میں جنگ کے خلاف عوامی جذبات کی شدت میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ جنگ کو انسان اور انسانی اقدار کے سب سے طاقتور دشمن کی شکل میں دیکھا جا رہا ہے۔ اس کے خلاف جذبات کا اظہار ذرائع ابلاغ کے وسیلوں کے علاوہ پرجوش عوامی مظاہروں میں ہوتا رہتا ہے۔ اس موضوع پر شائع شدہ کئی تصنیفات دانشورانہ حلقوں میں موضوعِ بحث ہیں۔ اس سلسلے میں رچرڈ ہومز (Richard Holmes) کی ایک دلچسپ تصنیف Acts of war : The Behaviour of men in Battle حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ یہ تصنیف فوجیوں کی نفسیات اور عادات پر جنگ کے ہولناک اثرات کی تصویریں پیش کرتی ہے۔ جنگ میں برسرِ پیکار انسان خوف و دہشت کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے تھکاوٹ او راعصابی تناؤ کے شکار ہوکر مناسب، حتیٰ کہ فرار کی گھناؤنی راہیں اختیار کرلیتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ جنگ اور تسخیر کو جو مرکزیت نوقدامت پسندی میں حاصل ہے۔ اس کے خلاف درج بالا طرزِ فکر کی طرف سے مزاحمت ہو رہی ہے۔

نوقدامت طرزِ فکر کو یورپ، خصوصاً فرانس اور جرمنی میں، موافقت کا ماحول میسر نہیں ہے۔ عراق کے خلاف امریکی جارحیت کے سلسلے میں پورے یورپ میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ سرکاری سطح پر بھی اس جارحیت کی شدید تنقید ہوئی۔ جارج بش نے جھنجھلاہٹ میں اس طرزِ فکر کو، پرانی یورپی طرزِ فکر، سے تعبیر کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یورپ میں دہشت گردی کے حوالے سے سخت اقدامات کو تشکیل دیا جارہا ہے، یہ اقدامات براہِ راست مہاجرین کے حقوق انسانی پر بری طرح اثر انداز ہوں گے۔ تاہم نوقدامت پسندی کا اثر بحیثیت مجموعی یورپ کی طرزِ فکر میں نظر نہیں آرہا ہے۔ پچھلے سال فرانس میں جاں پال سارتر کی ایک ضخیم سوانح حیات فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوئی۔ اس میں سارتر کے خیالات و افکار اور ان کے سیاسی اعتقادات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ امریکی مبصروں نے اپنے تجزیوں میں سارتر کی وجودیت پر اپنے ردِعمل کے ساتھ ساتھ سارتر کی سیاسی فعالیت پر طنز بھی کیے ہیں۔

دنیا کے دور دراز علاقے اور خطے معاشی اور ثقافتی عالمگیریت کے دائرۂ اثر میں آرہے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور انسانی مسائل میں شدید اضافہ ہو رہا ہے۔ نسل پرستی، معاشی اور سماجی بے انصافی، فرقہ واریت، تعصب، خواتین کے حقوق کی پامالی، نوفسطائیت اور بے روزگاری کے مسائل میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان مسائل کا حل کسی مخصوص نظریاتی دائرۂ فکر کے اندر تلاش کرنا مشکل ہے۔ ان مسائل کو حقوقِ انسانی کے دائرۂ کار کے اندر لاکر انھیں حل کرنے کی کوششوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ اور یہ روایتی نظریات، کے متبادل کے طور پر ابھر کر سامنے آرہا ہے۔

(بشکریہ "شاعر" ممبئی)

A-39, South Extension Part-1,
New Delhi-110 049

□□□

سرور عالم راز

رومن اردو کا ایک جامع نظام

ابتدائیہ

انگریزی رسم خط میں اردو زبان کی کتابت کو "رومن اردو" کہا جاتا ہے۔ رومن اردو کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ ہندستان پر اپنی حکومت کے دوران انگریز اپنی تحریروں میں مقامی زبانوں کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران بھی پروپیگنڈے کی خاطر حکومت کی جانب سے رومن اردو میں اخبارات و رسائل شائع ہوا کرتے تھے جو جنگ کے اختتام پر اپنے فطری انجام کو پہنچے اور بند ہو گئے۔ حال ہی میں اخبار "جنگ" (پاکستان) نے جزوی طور پر رومن اردو میں اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ کمپیوٹر انٹرنیٹ کی اردو محفلوں میں بھی تقریباً سارا کام رومن اردو میں ہی ہوتا ہے۔ رومن اردو کے ایک سکہ بند اور ٹکسالی نظام (standard system) کی عدم موجودگی میں رومن اردو کے متعدد طریقے رائج ہیں جو نہ صرف مکمل اور جامع نہیں ہیں بلکہ اندرونی ناہمواری اور تضادات کا شکار بھی ہیں۔ اب تک کوئی ایسا نظامِ تحریر تجویز نہیں کیا گیا ہے جو اردو کتابت اور تلفظ کے جملہ رموز و نکات کا احاطہ کرتا ہو اور اپنے اندر ایک ٹکسالی نظام بننے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ فی زمانہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے وقت اور فاصلوں کی طنابیں کھینچ کر دنیا کو نہایت مختصر کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ کی زبان دنیا بھر میں انگریزی ہی ہے۔ چنانچہ اس کے رسمِ خط کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا دانشمندی کی دلیل ہے۔ زیرِ نظر مقالے کا مقصد رومن اردو کا ایک جامع، مکمل اور قابلِ عمل نظام تجویز کرنا ہے۔ مجوزہ نظامِ تحریر کے مقاصد حسب ذیل ہیں:

(1) اردو کتابت اور تلفظ کے جملہ رموز و نکات کا احاطہ کرتے ہوئے رومن اردو کتابت کے اصول منضبط کرنا۔

(2) نظامِ تحریر کو اندرونی ناہمواریوں اور تضادات سے پاک رکھنا۔

(3) اردو اور رومن اردو کے مابین نقلِ تحریر (transliteration) کو آسان اور قابلِ عمل رکھنا تا کہ ایک معمولی پڑھا لکھا شخص بھی ایک زبان کی تحریر کو دوسری زبان میں صحیح نقل کر سکے۔

یہاں یہ وضاحت نہایت ضروری ہے کہ رومن اردو کے مجوزہ نظام کا مقصد اردو رسمِ خط کو کسی طرح بدلنا ہرگز نہیں ہے۔ راقم الحروف اردو رسمِ خط کے قیام و ثبات کا سختی سے قائل ہے اور ہر اس تحریک کا مخالف ہے جو کسی سطح پر بھی اردو رسمِ خط کو دیوناگری، انگریزی، یا کسی اور رسمِ خط سے بدلنے کی حامی ہو۔ مجوزہ نظامِ تحریر وقت کی بدلتی ہوئی اقدار اور تقاضوں کے عملی اعتراف کی ایک شکل ہے اور اس کا واحد مقصد اردو کو ان تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت فراہم کرنا ہے۔

مروجہ رومن اردو کتابت کی مشکلات

ذیل میں رومن اردو کتابت کے مروجہ طریقوں کے چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان پر ایک نظر ہی ان کی مشکلات اور خامیوں کی نشاندہی کے لیے کافی ہے۔ ان طریقوں سے ایسے معمولی پڑھے لکھے لوگوں کا کام تو کم و بیش چل سکتا ہے جن کو زبان و ادب سے دلچسپی نہیں ہے لیکن اہلِ ادب کی تشفی ان سے ممکن نہیں ہے۔

مروجہ رومن اردو کتابت کے چند نمونے:

naqsh faryaadii hai kis kii sho;xii-e ta;hriir kaa
kaa;Ga;zii hai pairahan har paikar-e ta.sviir kaa
kaav-kaav-esa;xt-jaaniihaa-etanhaa))ii nah punchh
.sub;h karnaa shaam kaa laanaa hai juu-e shiir kaa
ja;zbah-e-be-i;xtiyaar-e shauq dekhaa chaahiye
siinah-e shamshiir se baahar hai dam shamshiir kaa

kywN hm sey hwa'ey Aap KHfA kwn btAa'ey?
AaKHr hwa'y kyA Aysy KHTOA kwn btAa'ey?
bygAna' hsty hwN myN gm krdh mnzl
bhTkey hwa'ey rAhy kw ptA kwn btAa'ey?
m kw hey glA hm sey dnyA kw ShkAyt
kyA KHwb CHly hey yh hwA kwn btAa'ey!

vo bhii kyaa log the aasaan thii raahe.n jin kii
band aa.Nkhe.n kiye ik simt chale jaate the
aql-o-dil khvaab-o-haqiiqat kii na uljhan na Khalish
muKhtalif jalve nigaaho.n ko na bahalaate the

qaaraeen se guzaarish hai keh woh roman urdu qaai'de ka mutaal'ah zaroor kareN, is se unheN roman urdu paRhne aur samajhne meN asaanee rahe gee. kiyooNkeh urdu ko romanize karte huey maihaz angrezee huroof-e-tahajee ka sahaara nahiN liya gaya balkeh jahaaN tak mumkin hua us ke baa-qaai'da usool-o- zawaabit bhee banaae gae haiN taakeh urdu ka husn aur shustagee barqaraar rahe. is ke 'ilaawa roman

urdu qaai'de ke mutaal'e se aap hamaare kaee silsiloN maslan chaupaal ya cricket matchoN par online tabsroN meN behtar taur par shirkat kar sakeN ge.

vaqt Khush Khush kaaTne kaa mashvara dete huve
ro paRaa vo aap mujh ko hausala dete huve
us se kab dekhee ga'yee thee mere ruKh kee murdanee
phair letaa thaa vo moonh mujh ko davaa dete huve
bai-amaaN thaa aap lekin mu'jiza ye hai 'Riaz'
haala e shafqat thaa us ko aasraa dete huve

رومن طریق تحریر کی ان مثالوں میں درج ذیل مشکلات نظر آتی ہیں:

(1) بیشتر نظام تحریر اردو کے ہم صوت حروف (ا، ع)؛ (ذ، ز، ض، ظ)؛ (ت، ط)؛ (ث، س، ص) میں تمیز نہیں کرتے ہیں اور ان کی ادائیگی کے لیے کسی ایک رومن حرف کو ہی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ''ذ، ز، ض، ظ کے لیے Z لکھا جاتا ہے۔ اس طرز عمل سے نہ صرف یہ کہ اردو کا صحیح املا مسخ ہو جاتا ہے بلکہ ایسے بہت سے الفاظ کی ادائیگی اور الہام و تفہیم بھی غیر ممکن ہو جاتی ہے جو املا بدلنے سے غیر واضح ہو جاتے ہیں اور اکثر مختلف معانی بھی اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً اِسم اور اِثم؛ اَرَب اور عَرَب؛ اَرض اور عَرض؛ ثواب اور صواب؛ اَلَم اور عَلَم وغیرہ۔

(2) ان میں سے کوئی نظام بھی اعراب و حرکات لگانے کا ایک معقول و مربوط طریقہ استعمال نہیں کرتا ہے اور اکثر صرف اندازے سے ہی تحریر پڑھنی پڑتی ہے۔ اردو میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کا املا تو ایک ہی ہے لیکن جن پر اعراب بدلنے سے ان کے معانی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً ''بَری (آزاد) اور بُری (زمینی)؛ بَس (کافی) اور بِس (زہر)؛ دَرد (تکلیف) اور دُرد (تلچھٹ)؛ مَلِک (بادشاہ)، مَلَک (فرشتہ)، مُلک (دیس) اور مِلک (جائداد)۔

(3) بعض نظام حروف ہجا اور اعراب کے لیے ایسی مشکل اور عجیب و غریب علامات استعمال کرتے ہیں کہ ان کو سمجھنا، پڑھنا اور پھر استعمال کرنا عوام تو کیا اہل علم کے لیے بھی آسان نہیں ہے۔

(4) اکثر نظام اندرونی ناہمواری اور تضاد کا شکار ہیں جو بجائے خود ایک یکسانی نظام کی ترویج اور نفاذ کی راہ میں حائل ہیں۔

(5) یہ نظام اردو اور رومن کے مابین آسان اور قابل عمل نقل تحریر (transliteration) کی سہولت فراہم نہیں کرتے ہیں۔

مجوزہ نظام کے بنیادی اصول

زیر نظر نظام اوپر دی ہوئی سب مشکلات اور خامیوں کا مناسب، آسان اور جامع حل پیش کرتا ہے۔ اس نظام تحریر کی جامعیت اور آسانی مندرجہ ذیل اصولوں پر مبنی ہے:

(1) اردو کے تمام حروف ہجا اور علامات و اعراب کے لیے منفرد رومن حروف و علامات استعمال کیے جائیں گے اور یہ حروف و علامات پھر کسی اور مقصد کے لیے استعمال نہیں ہوں گے۔

(2) اردو کے ہم صوت الفاظ کی کتابت کے امتیاز کو رومن اردو میں قائم رکھا جائے گا یعنی ایک ہی رومن حرف سے اردو کے متعدد ہم صوت حروف نہیں دکھائے جائیں گے۔

(3) اردو اور رومن اردو کے مابین نقل تحریر کی آسانی ایک بنیادی ضرورت ہے جسے یہ نظام پورا کرے گا۔

(4) مجوزہ نظام میں اس کی بنیادی صورت کو مجروح کیے بغیر اصلاح و ترمیم کی گنجائش رکھی جائے گی۔

اس نظام کی تفاصیل بیان کرنے میں اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ رومن اردو کا کوئی اصول کتابت یا تفصیل بیان کرنے سے قبل اس سے متعلق تمام نکات واضح کر دیے جائیں تاکہ بلا ضرورت مضمون کے صفحات پلٹنے کی ضرورت نہ ہو۔

اردو کے حروف ہجا

اردو کے بنیادی حروف ہجا عربی سے مستعار ہیں۔ عربی حروف ہجا میں اہل فارس کے چند اضافوں کے بعد اہل ہند نے بھی ان میں اپنی ضرورت کی بنا پر چند حروف کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح اردو کے جو حروف ہجا وجود میں آئے وہ حسب ذیل ہیں:

● **عربی سے مستعار بنیادی حروف:** ان حروف کی کل تعداد انتیس (29) ہے:

ا	ب	ت	ث	ج	ح
خ	د	ذ	ر	ز	س
ش	ص	ض	ط	ظ	ع
غ	ف	ق	ک	ل	م
ن	و	ہ	ی		

● **اہل ایران کے وضع کردہ اضافی حروف:** درج بالا حروف میں اہل ایران نے پانچ نئے حروف کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح یہ تعداد چونتیس (34) ہوگئی:

پ چ ژ گ ے

ان حروف میں سے ژ کے علاوہ سب ہندی میں مستعمل ہیں۔ ژ فارسی کا خاص حرف ہے جو اس زبان میں بھی معدودے چند الفاظ ہی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

● اہل ہند کے وضع کردہ اضافی حروف: مندرجۂ بالا چونتیس (34) حروف ہجا میں اہل ہند نے تین حروف کا اضافہ کیا اور اس طرح ان کی تعداد سینتیس (37) ہوگئی:

ٹ ڈ ڑ

یہ درشت آوازیں مقامی زبانوں کا حصہ تھیں اور ان کی شمولیت نے اردو کو نئی آوازوں کی ادائیگی کی صلاحیت سے آشنا کیا۔ اس ضروری اضافے کے باوجود ہندی کے بہت سے ایسے الفاظ تھے جن کی ادائیگی درج بالا حروف سے بھی ممکن نہیں تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے دس (10) مرکب حروف وضع کیے گئے:

بھ پھ تھ ٹھ جھ
چھ دھ ڈھ کھ گھ

ان حروف میں سے ہر ایک حرف الفاظ کے شروع میں آسکتا ہے اور اکثر حروف الفاظ کے درمیان اور آخر میں بھی آتے ہیں: (بھول، دوبھر، لابھ)؛ (پھر، بپھر)؛ (تھم، گتھی، ہاتھ)؛ (ٹھیک، گٹھری، کاٹھ)؛ (جھرنا، مجھے، بانجھ)؛ (چھرا، اچھا، کچھ)؛ (دھن، آدھا، دودھ)؛ (ڈھیر، گڈھا)؛ (کھانا، دیکھنا، ایکھ)، (گھر، بگھارنا، سنگھ)۔

ان مرکب حروف کے علاوہ پانچ ایسے مرکب حروف مزید وضع کیے گئے جو الفاظ کے درمیان یا آخر میں تو آتے ہیں لیکن ان کے شروع میں کبھی نہیں استعمال ہوتے ہیں:

رھ	ڑھ	لھ	مھ	نھ
تیرھواں	آڑھت، گڑھ	کولھو	کمھار	ننھا، منھ

ان سب حروف کو شمار کیجیے تو مجموعی تعداد باون (52) قرار پاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ بنیادی حروف وہی سینتیس (37) ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور جن میں مرکب حروف شامل نہیں ہیں۔

● اردو حروف سے رومن حروف کی تطبیق

یہ ظاہر ہے کہ تمام اردو حروف کو ادا کرنے کے لیے محض چھبیس (26) رومن حروف ناکافی ہیں اور اس مقصد کے لیے رومن حروف کی کچھ اور ترمیم شدہ صورتیں وضع کرنی ضروری ہیں۔ نیچے دیے ہوئے نقشے میں اردو حروف کے لیے رومن حروف کی وہ متبادل شکلیں دی جارہی ہیں جو مجوزہ نظام میں استعمال کی گئی ہیں:

ا	ب	پ	ت	ٹ	ث	ج	چ
a	b	p	t	T	c	j	ch
ح	خ	د	ڈ	ذ	ر	ڑ	ز
H	kh	d	D	Z	r	R	z
ژ	س	ش	ص	ض	ط	ظ	ع
zh	s	sh	S	Z^	t^	z^	a'
غ	ف	ق	ک	گ	ل	م	ن
Gh	f	q	k	g	l	m	n
و	ہ	ھ	ی	ے	ں		
v,w	h	h~	Y	y	N		
بھ	پھ	تھ	ٹھ	جھ	چھ	دھ	ڈھ
bh~	ph~	th~	Th~	jh~	ch~	dh~	Dh~
کھ	گھ	رھ	ڑھ	لھ	مھ	نھ	
kh~	gh~	rh~	Rh~	lh~	mh~	nh~	

حواشی:

(1) یہاں خ اور غ کو بالترتیب K اور G سے دکھانے کی بجائے Kh اور Gh سے ادا کیا گیا ہے تاکہ ان مرکب حروف کو دیکھتے ہی ذہن متعلقہ اردو حروف کی جانب منتقل ہوجائے۔ مزید یہ کہ کھ اور گھ کو kh اور gh سے ادا کرنے کے بعد خ اور غ کو kh اور Gh سے ادا کرنا ایک فطری امر بھی ہے۔

(2) ض، ط اور ظ کے لیے بالترتیب Z^ اور t^ اور z^ استعمال کیے گئے ہیں۔ ان حروف پر لگا ہوا امتیازی نشان (^) کمپیوٹر کی بورڈ computer keyboard پر آسانی سے ٹائپ ہوسکتا ہے اور ہاتھ سے بھی بنایا جاسکتا ہے۔

(3) ہائے دوچشمی ھ (h~) کو ہائے ہوز ہ (h~) سے ممتاز رکھا گیا ہے کیونکہ مرکب ہندی حروف کا استعمال ہائے دوچشمی کے ساتھ ہی صحیح ہے۔ اگر اس کے بجائے ہائے ہوز لکھی جائے تو وہ علاحدہ حرف کی طرح ادا ہوگی جب کہ ہائے دوچشمی الفاظ میں گھل مل جاتی ہے، مثلاً بھن اور بہن؛ پھاڑ اور پہاڑ؛ ٹھوکا اور ٹہوکا؛ چھرا اور چہرا؛ گھر اور گہر وغیرہ۔ یہ تفریق اردو اور رومن اردو کے باہمی نقل تحریر (transliteration) کے لیے اشد ضروری ہے۔

(4) الف کے لیے a اور عین کے لیے a' کے استعمال کی وجہ ان حروف کی آوازوں کی مماثلت ہے۔ اردو میں ان حروف کی آوازوں میں تفریق نہیں کی جاتی ہے لیکن چونکہ الف اور عین کی تحریری صورت مختلف ہے اس لیے رومن اردو میں یہ امتیاز قائم رکھنا ضروری ہے تاکہ اردو اور رومن اردو کے باہمی نقل تحریر (transliteration) آسانی [illegible]

(5) یہاں یہ وضاحت بھی اشد ضروری ہے کہ apostrophe کی علامت (') اس نظام میں حرف عین کے لیے مختص کر دی گئی ہے۔ یعنی جہاں کہیں بھی یہ علامت نظر آئے گی وہاں متعلقہ حرف یا علامت کو عین سے وابستہ سمجھا جائے گا۔ اس اصول کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اعراب اور حرکات

حروف ہجا کو آپس میں مختلف اعراب و حرکات (زیر، زبر، پیش وغیرہ) سے ملا کر الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ رومن اردو میں ان اعراب کی متبادل صورتیں ظاہر کرنا اشد ضروری ہے تاکہ صحیح کتابت، تلفظ اور نقل تحریر بخوبی ہوسکیں۔ آوازوں کو یہاں دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(1) چھوٹی آوازیں مثلاً اَب، اِس، اُس

(2) لمبی آوازیں مثلاً آور، اوس، دیر، خیر، ایکھ

اعراب و حرکات کی درج ذیل تفصیل اردو املا اور تلفظ کے تقریباً تمام رموز و جزویات کا احاطہ کرتی ہے۔ اپنی ظاہری طوالت کے باوجود یہ تفصیل آسان اور عام فہم ہے اور ذرا سی توجہ اور محنت سے اس پر عمل ممکن ہے۔ رومن تحریر کے ہر نظام کے استعمال سے قبل اس کے کلیدی اصول ذہن نشیں کرنے ضروری ہیں۔ مجوزہ نظام کے اصولوں کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ اس نظام تحریر کی جامعیت تفصیل کی متقاضی ہے۔ ان تفاصیل سے اعراض کر کے کوئی بھی نظام جامعیت کا دعوا نہیں کرسکتا ہے۔

اعراب کی چھوٹی آوازیں

یہ آوازیں تقریباً" ہمیشہ ہی الفاظ کے شروع یا درمیان میں آتی ہیں۔ الف اور عین کے علاوہ اور تمام حروف ہجا پر ان آوازوں کے عمل کا اظہار آسان ہے۔ البتہ الف اور عین کے تعلق سے کچھ دقت پیش آتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ان حروف کی آوازوں کی مماثلت ہے اور دوسری وجہ تلفظ اور املا کی وہ مخصوص صورتیں ہیں جو ان کے اشتراک سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ان صورتوں کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

زبر (فتح) کی چھوٹی آواز

یہ آواز جو کسی حرف پر زبر (فتح) لگا کر ادا کی جاتی ہے (مثلاً "اَب، سَبَب) رومن اردو میں a سے دکھائی جائے گی اور اس کو متعلقہ حرف کے فوراً بعد لکھا جائے گا۔ الف اور عین کے علاوہ اس اصول کا اطلاق سب حروف پر ہوگا، مثلاً":

بَرحق	زَخم	بَرزَخ	سَبَب
barHaq	zakhm	barzakh	Sabab

الف پر زبر کی چھوٹی آواز

چونکہ اس نظام تحریر میں الف کے لیے a استعمال کیا گیا ہے اس لیے زبر کے لیے بھی a لکھنے سے غلطی کا احتمال ہوسکتا ہے۔ لیکن ذرا سے تفکر سے یہ خیال بے بنیاد ثابت ہوتا ہے۔ اردو میں الف زبر کی چھوٹی آواز کے ساتھ الفاظ کے صرف شروع ہی میں آتا ہے، درمیان یا آخر میں کبھی نہیں آتا۔ چنانچہ الف پر زبر لگانے کے اصول یوں بیان کیے جاسکتے ہیں:

(1) جب رومن تحریر میں a کسی لفظ کے شروع میں آئے گا تو وہ ہمیشہ اَلِف مفتوح (زبر والا الف) کا رومن متبادل مانا جائے گا۔

(2) جب رومن تحریر میں a کسی لفظ کے درمیان میں آئے گا تو اس سے متعلقہ حرف پر زبر متصور ہوگا۔

اَگر مَگر	اَدَب	اَفسَر	اَب
agar-magar	adab	afsar	ab

عین پر زبر کی چھوٹی آواز

چونکہ اس نظام تحریر میں عین کے لیے 'a استعمال کیا گیا ہے اس لیے اس کو زبر کی آواز دینا بہ ظاہر دقت طلب ہے۔ عین کی مفتوح (زبر والی) صورت الفاظ کے شروع، درمیان اور آخر میں آسکتی ہے۔ چنانچہ عین پر زبر لگانے کا اصول درج ذیل شکل میں معین کیا جاسکتا ہے:

جب رومن اردو میں 'a کہیں بھی اپنی چھوٹی آواز کے ساتھ آئے گا تو وہ عین مفتوح (زبر والا عین) مانا جائے گا۔ اس استعمال کی بنیاد (') apostrophe کو عین سے مختص کرنا ہے۔ گویا 'a سے زبر کی علامت a کا عین پر لگا ہونا (') سے ظاہر کیا جائے گا۔

شمَع	اَبعَد	لَعَب	عَجب	عَرض
shama'	aba'd	laa'b	a'jab	a'rz^

زیر (کسرہ) کی چھوٹی آواز

اردو میں کسی حرف پر زیر (کسرہ) لگا کر جو آواز ادا کی جاتی ہے (مثلاً "کِس، تِل) وہ رومن اردو میں i سے ادا کی جائے گی اور اس کو متعلقہ حرف کے فوراً" بعد لکھا جائے گا۔ الف اور عین کے علاوہ اس اصول کا اطلاق سب حروف پر ہوگا:

نَجِس	کِشمِش	بِس (زہر)
najis	kishmish	bis

الف پر زیر کی چھوٹی آواز

الف زیر کی چھوٹی آواز کے ساتھ الفاظ کے صرف شروع ہی میں آتا

ہے (مثلاً '' اِس، اِدھر)۔ الفاظ کے درمیان میں یا آخر میں کبھی نہیں آتا۔ اس حقیقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رومن اردو میں a (الف) پر زیر لگانے کا اصول درج ذیل ہے:

جب i کسی لفظ کے شروع میں آئے گا تو ہمیشہ وہ الفِ مکسور (زیر والا الف) کا رومن متبادل سمجھا جائے گا۔

اِردگرد	اِدھر	اِس
ird-gird	idh~ar	is

عین پر زیر کی چھوٹی آواز

عین زیر کی چھوٹی آواز کے ساتھ الفاظ کے شروع اور درمیان میں آتا ہے۔ الفاظ کے آخر میں یہ صرف تراکیب میں ہی آتا ہے (مثلاً شمعِ مزار)۔ چونکہ زیرنظر نظام میں عین کو 'a سے ظاہر کیا گیا ہے اس لیے اس پر زیر لگانے کا درج ذیل اصول معین کیا گیا ہے:

رومن اردو میں 'i سے مراد عین مکسور (زیر والی عین) ہوگی خواہ وہ عبارت میں کسی جگہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس اصول کی بنیاد بھی apostrophe (') کو عین کے ساتھ مختص کردینا ہے۔ گویا 'i سے زیر کی علامت کا عین پر لگا ہونا (') apostrophe سے ظاہر کیا گیا ہے۔

تعِب (تھکا ہوا)	عِبرت	بعِث (شب بیدار)	عِشرت
tai'b	i'brat	bai'c	i'shrat

حروف ہجا پر پیش (ضمہ) کی چھوٹی آواز

اردو میں کسی حرف پر پیش (ضمہ) لگا کر جو آواز ادا کی جاتی ہے (مثلاً '' اُس، بُت) اس کو رومن اردو میں u سے ادا کیا جائے گا اور اس کو متعلقہ حرف کے فوراً بعد لکھا جائے گا۔ الف اور عین کے علاوہ اس اصول کا اطلاق سب حروف پر ہوگا، مثلاً '':

بُلبُل	شگُن	گُذر	بُت
bulbul	shagun	guZar	but

الف پر پیش کی چھوٹی آواز

الف پیش کی چھوٹی آواز کے ساتھ الفاظ کے شروع میں ہی آتا ہے (مثلاً '' اُس، اُدھر)، درمیان میں یا آخر میں کبھی بھی نہیں آتا۔ چنانچہ رومن اردو میں a (الف) پر پیش لگانے کے مندرجہ اصول بنائے گئے ہیں:

(1) جب u کسی لفظ کے شروع میں آئے گا تو وہ ہمیشہ الف مضموم (پیش والا الف) مانا جائے گا۔

(2) جب u کسی لفظ کے درمیان میں یا آخر میں آئے گا تو وہ متعلقہ حرف پر پیش کی علامت مانا جائے گا۔

شُد بُد	اُثر (پیچھے)	اُدھر	اُس
shud-bud	ucr	udh~ar	us

عین پر پیش کی چھوٹی آواز

عین پیش کے ساتھ الفاظ کے شروع یا درمیان میں آتا ہے۔ زیرنظر نظام تحریر میں عین کو 'a سے ظاہر کیا گیا ہے اور اس پر پیش لگانے کا مندرجہ ذیل اصول اپنایا گیا ہے:

رومن اردو میں عین مضمومہ کو 'u سے دکھایا جائے گا۔

اس اصول کی بنیاد اس بات پر ہے کہ یہاں u سے پیش کی علامت دکھائی گئی ہے اور (') apostrophe عین کی شناخت کے لیے مختص کردیا گیا ہے۔ گویا 'u سے پیش کی علامت کا عین پر لگا ہونا اس پر (') apostrophe لگا کر کیا گیا ہے۔

سُعُر (عذاب)	عُسرت	عُجلت	عُذر
suu'r	u'srat	U'jlat	u'zr

اعراب کی لمبی آوازیں

اردو میں اعراب کی لمبی آوازیں مختلف صورتوں میں مستعمل ہیں۔ ان آوازوں کی تفصیل اور رومن اردو میں ان کی ادائیگی کے اصول پر یہاں مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

● **زبر کی لمبی آوازیں:** اردو میں زبر کی لمبی آوازیں پانچ طرح سے آتی ہیں:

(1) الفاظ کے شروع میں، مثلاً آج، آم

(2) الفاظ کے درمیان میں مثلاً آغاز، دلنواز

(3) الفاظ کے آخر میں مثلاً خدا، برملا

(4) حروف کو ے کے ساتھ زبر سے ملا کر مثلاً جَیسا، مائین

(5) حروف کو واو کے ساتھ زبر سے ملا کر مثلاً ہَور، فو

● **مختلف حروف پر لمبا زبر:** مختلف حروف ہجا پر لمبا زبر لگانے کی تفصیل درج ذیل گروہوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

(ا) عین کے علاوہ اس نظام میں الفاظ کے شروع، درمیان یا آخر میں آنے والے دوسرے حروف کے ساتھ والی لمبے زبر کی آوازیں aa سے ادا کی جائیں گی۔

برملا	خدا	دلنواز	آغاز	آم	باور
barmalaa	khudaa	dilnawaaz	aaGhaaz	aam	baawar

(ب) عین کے علاوہ دوسرے سب حروف ہجا کو یائے مجہول (ے)

کے ساتھ زبر سے ملانے سے جو آواز پیدا کی جاتی ہے (مثلاً جیسا، ذیر) اس کو رومن اردو میں ai سے ادا کیا جائے گا اور یہ علامت متعلقہ حرف کے فوراً بعد لگائی جائے گی۔

جیسا	مابین	فیض	خیرات	ایسا
jaisaa	maabain	faiZ^	khairaat	aisaa

(پ) عین کے علاوہ دوسرے سب حروف ہجا کو واو کے ساتھ زبر سے ملانے سے جو آواز پیدا کی جاتی ہے (مثلاً اَور، غور) اس کو رومن اردو میں au سے ادا کیا جائے گا اور یہ علامت متعلقہ حرف کے فوراً بعد لگائی جائے گی۔

اور	بغور	ضو	طوق	دوران
aur	baGhaur	Z^au	t^auq	dauraan

• عین پر لمبا زبر

عین کو الف، واو اور ے سے زبر کے ذریعے ملا کر جو آوازیں پیدا کی جاتی ہیں وہ اوپر دی ہوئی آوازوں کی طرح ہی ہیں۔ البتہ الف اور عین کو بالترتیب a اور 'a سے دکھانا ان کو آپس میں ملانے اور زبر کی مختلف صورتوں کی وضاحت کے عمل کو مشکل بنا دیتا ہے۔ اگر یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ اس نظام میں عین سے کسی حرف یا علامت کی نسبت (') apostrophe سے ظاہر کی گئی ہے تو درج ذیل اصول بنائے جا سکتے ہیں:

(1) عین اور الف کے اشتراک سے جو لمبی آوازیں پیدا ہوتی ہیں، وہ a'a یا 'aa سے ادا کی جائیں گی، مثلاً:

شعاع	عادت	عارض	عام
shua'a,a'	a'adat	a'ariZ^	a'am

یہاں (') comma کا استعمال تلفظ کی صراحت کے لیے کیا گیا ہے۔ اگر اس کو نہ لکھا جائے تو 'a'aa کی متصل شکل افہام و تفہیم میں مانع ہو سکتی ہے۔

(2) عین کو واو کے ساتھ زبر سے ملا کر جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کو a'u سے ادا کیا جائے گا:

عورت	عورہ	عون	فرعون
a'urat	a'urah	a'un	fira'un

(3) عین کو یائے مجہول ے کے ساتھ زبر سے ملا کر جو آواز پیدا کی جاتی ہے اس کو a'i سے ادا کیا جائے گا:

عینک	عیب	عیش	عین
a'inak	a'ib	a'ish	a'in

زیر کی لمبی آوازیں:

اردو میں زیر کی لمبی صورتوں کی دو صورتیں مستعمل ہیں۔ پہلی صورت میں حروف ہجا کو یائے معروف ی کے ساتھ ملا کر ایک لمبی کھنچی آواز پیدا کی جاتی ہے مثلاً عجیب، ایمان وغیرہ۔ دوسری صورت میں حروف ہجا کو یائے مجہول ے کے ساتھ زیر سے ملا کر ایک درمیانی سی آواز پیدا کی جاتی ہے مثلاً نیک، درویش وغیرہ۔ زیر نظر نظام میں ان صورتوں کے اصول درج ذیل ہیں:

• حروف ہجا کو یائے معروف ی سے ملا کر جو آواز پیدا کی جاتی ہے (مثلاً عجیب، غریب) اس کو رومن اردو میں ee سے ادا کیا جائے گا اور یہ علامت متعلقہ حرف کے فوراً بعد لگائی جائے گی۔ الف اور عین کی مخصوص صورتوں کے علاوہ یہ اصول ہر حرف تہجی پر کاربند ہوگا۔

عجیب	غریب	سرسری	پھیکی	نمکین
a'jeeb	Ghareeb	sarsaree	ph~eekee	namkeen

• الف پر زیر کے استعمال سے لمبی آواز الفاظ کے شروع یا درمیان میں آسکتی ہے۔

(ا) الفاظ کے شروع میں الف پر زیر کی لمبی آواز ہمیشہ ee سے دکھائی جائے گی۔

ایمان	اعجاز	ایثار	ایماء
eemaan	eejaaz	eecaar	eemaa

(ب) الفاظ کے درمیان میں آنے والے الف کے ساتھ زیر کی لمبی آواز ہمزہ کی وساطت سے آتی ہے (مثلاً آئی، دہائی)۔ یہاں بھی یہ آواز ee سے ہی ادا کی جائے گی اور اس کو ی (y) سے وابستہ کر کے ادائیگی کی جائے گی۔ وضاحتی (,) comma کا استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن ایسا کرنا ضروری نہیں ہے۔ راقم خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کا استعمال پڑھنے میں سہولت کا باعث ہوگا کہ نہیں:

آئی	دہائی	زائیدہ	تائید
aa,yee	duhaayee	zaayeedah	taa,yeed

• عین پر زیر کے استعمال سے لمبی آواز الفاظ کے شروع یا درمیان میں آسکتی ہے۔ عین کے حوالے سے سب اصول اس حقیقت پر مبنی ہیں کہ اس نظام میں عین کی آواز اور شناخت کے لیے (') apostrophe کو مختص کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہاں عین کی لمبی آواز ہمیشہ e'e سے دکھائی جائے گی خواہ وہ لفظ کے شروع میں ہو یا درمیان میں یا آخر میں۔

عید عیسوی بعید سعید شئی

sae'e sae'ed bae'ed e'esawee e'ed

● حروف ہجا کو یائے مجہول ے کے ساتھ زیر سے ملا کر جو آواز پیدا کی جاتی ہے (مثلاً نیک) اس کو رومن اردو میں e سے ادا کیا جائے گا اور اس علامت کو متعلقہ حرف کے فوراً بعد لگایا جائے گا۔

نیک ایک درویش شکیب

shakeb darvesh ek nek

● پیش کی لمبی آوازیں: اردو میں پیش کی جو دو صورتیں مستعمل ہیں رومن اردو میں ان کی ادائیگی کے اصول حسب ذیل ہیں:

(1) مختلف حروف ہجا کو واو سے پیش کے ذریعے ملا کر نکالی جانے والی وہ آواز جو "سوگ" میں ظاہر ہے رومن اردو میں o سے ادا کی جائے گی اور اس علامت کو متعلقہ حرف کے فوراً بعد دکھایا جائے گا۔ اگر o لفظ کے شروع میں آئے گا تو اس کو "الف، واو پیش او" سمجھا جائے گا۔ باقی ہر مقام پر اس کو متعلقہ حرف پر پیش مانا جائے گا۔

سوز بوجھ لوگو دیکھو اوچھا

och~aa dekh~o logo bojh~ soz

(2) حروف ہجا کو واو سے پیش کے ذریعے ملا کر نکالی جانے والی آواز جو "اوپر" میں ظاہر ہے اس کو رومن اردو میں oo سے ادا کیا جائے گا اور یہ علامت متعلقہ حرف کے فوراً بعد لگائی جائے گی۔ اگر oo لفظ کے شروع میں آئے گا تو اس کو "الف پیش او" سمجھا جائے گا۔ باقی ہر مقام استعمال پر اس کو متعلقہ حرف پر پیش مانا جائے گا۔ نیز یہ کہ "عین پیش عُو" کو o'o سے ادا کیا جائے گا، گویا o'o میں apostrophe یعنی (') کی موجودگی اس آواز کی عین سے وابستگی کو ظاہر کرے گی۔

اُوپر وضو مجبور عُود موعود طاعون

t^aao'on mauo'od o'od majboor vuz^oo oopar

چند مخصوص صورتیں:

اس عنوان کے تحت اردو املا اور تلفظ کی چند مخصوص صورتوں کی رومن اردو میں ادائیگی کے قوانین کا انضباط مقصود ہے۔ یہ اقدام اردو اور رومن اردو کے مابین نقل تحریر (transliteration) اور نظام کی جامعیت کے لیے اشد ضروری ہے۔

● **اسمائے خاص:** اردو کے اسمائے خاص انگریزی رسم خط میں متعدد شکلوں میں لکھے جاتے ہیں۔ اس نظام میں انگریزی میں اسمائے خاص لکھنے کی سب صورتیں قابل قبول ہوں گی اور ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔

رحمن صدیقی محمد ابراہیم نظامی چودھری

Choudhry Nizamee Ibraheem Muhammad Siddiqui Rehman

Chaudhry Nizami Ibrahim Mohammad Siddiqee Rahman

● اردو میں غیر زبانوں کے جو الفاظ عام طور سے مستعمل ہیں اور جن کا کوئی اردو متبادل نہیں ہے ان کے املا میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

کار ریفریجریٹر پلیٹ سائیکل اسٹیڈیم اسکول

school stadium cycle plate refrigerater car

● **مشدد حروف:** رومن اردو میں مشدد حروف کی ادائیگی ان کو دو مرتبہ لکھ کر کی جائے گی:

شدت تعجب حجام رویہ تکلفات مصوری

muSawwree takallufaat rawayyah Hajjam ta,a'jjub shiddat

7.4 تنوین: رومن اردو میں تنوین متعلقہ حرف پر ('') لگا کر ظاہر کی جائے گی جیسا کہ اردو کا بھی قاعدہ ہے۔

فرداً غالباً مثلاً اجمالاً

ijmaala" macla" Ghaaliba" farda"

● **جڑواں الفاظ، سابقے اور لاحقے:** اردو میں ایسے سیکڑوں الفاظ مستعمل ہیں جو دو مختلف الفاظ سے مرکب ہیں۔ ایسے سب الفاظ کو رومن اردو میں (-) dash سے الگ کر کے واضح کیا جائے گا۔

الم غلم اوبڑ کھابڑ غل غپاڑہ اردگرد

ird-gird ghul-ghaparah oobar-kh-aabar allam-Ghallam

ہوحق گنا چنا تام جھام دھوم دھڑکا

dh~oom-dh-arakka taam-jh~aam ginaa-chunaa hoo-Haq

● **تراکیب:** اردو میں تراکیب فارسی یا عربی کے اصولوں پر بنائی جاتی ہیں۔ یہ تراکیب الفاظ یا ان کے مشتقات سے تشکیل دی جاتی ہیں۔ کتابت کی آسانی اور وضاحت کے پیش نظر تراکیب کی رومن اردو میں کتابت کے درج ذیل اصول بنائے جا رہے ہیں:

(1) کچھ تراکیب الفاظ سے تشکیل پذیر ہوتی ہیں لہٰذا ایسی تراکیب کے اجزا کو (-) dash سے الگ الگ کر کے دکھایا جائے گا تا کہ پڑھنے میں آسانی ہو۔

زمانہ ساز　　غزل نواز　　ستم پیشہ　　خزاں گزیدہ

khizaaN-gazeedah sitam-peshah Ghazal-newaaz zamaanah-saaz

(2) کچھ تراکیب الفاظ اور ان کے مشتقات سے تشکیل دی جاتی ہیں۔ یہ بغیر (-) dash کے بھی لکھی جا سکتی ہیں اور وضاحتی dash کے ساتھ بھی۔

ستم گر　　ہم سفر　　سخن ور　　دل سوز

dilsoz sukhanwar ham-safar sitam-gar

● **واو عطف:** اردو میں دو الفاظ کو جوڑنے کے لیے واو عطف کا استعمال کیا جاتا ہے۔ رومن اردو کی کتابت میں اس کو -o- سے دکھایا جائے گا۔

شب و روز　　دل و جان　　خواب و خیال　　جنت و دوزخ

jannat-o-dozakh khwaab-o-khayaal dil-o-jaan shab-o-roz

● **اضافت:** اردو میں اضافت کی جو متعدد صورتیں مستعمل ہیں ان سب کو رومن اردو میں -e- سے دکھایا جائے گا۔

شہر نگار　　دوریٔ منزل　　ترانۂ محبت

taraanah-e-muHabbat dooree-e-manzil shehr-e-nigaar

جذبۂ تشکر　　آبنائے غزل　　رعنائی خیال

ra'naayee-e-khayaal aabnaay-e-ghazal jazbah-e-tashakkur

● متفرق اصول:

(1) اردو میں بہت سے الفاظ کا املا الف اور ہائے ہوز (ہ) دونوں سے مستعمل ہے۔ رومن اردو میں دونوں ہی صورتیں قابل قبول ہوں گی۔

کنارہ۔ کنارا　　سہارہ۔ سہارا　　پردہ۔ پردا　　دعوہ۔ دعویٰ

da'wah/da'waa pardah/pardaa sahaarah/sahaaraa kinaarah/kinaaraa

(2) جن الفاظ کے آخر میں ہائے ہوز (ہ) آتی ہے مگر تلفظ میں واضح نہیں کی جاتی ہے وہ رومن اردو میں بھی h کے ساتھ لکھے جائیں گے۔

محترمہ　　مروجہ　　مشاہدہ　　تبصرہ

tabSirah mushaahidah muravvajah muHtarimah

(3) ایسے الفاظ جن میں واؤ لکھا تو جاتا ہے لیکن کہنے میں واضح طور سے ادا نہیں ہوتا ہے رومن اردو میں بھی واو (v,w) کے ساتھ لکھے جائیں گے۔

خواب　　خواہ مخواہ　　دلخواہ

dilkhwaah khwaah-makhwaah khvaab

(4) وہ الفاظ جن کے شروع میں ''بے، الف، لام'' کا مرکب آتا ہے۔ لیکن ادائیگی میں الف کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے رومن اردو میں حسب ذیل صورت سے واضح کیے جائیں گے۔

بالاتفاق　　بالفرض　　بالمشافہ　　بالکل

b.ilkul b.ilmushaafah b.ilfarZ^ b.ilittifaaq

(5) اردو کے وہ الفاظ جو ''افعال متعلقہ (علت)'' کی تعریف میں آتے ہیں (مثلاً جبکہ، چنانچہ وغیرہ) رومن اردو میں درج ذیل طریقے سے دکھائے جائیں گے:

جبکہ　　چونکہ　　حالانکہ　　چنانچہ　　اگرچہ

agar_ch chunaan_ch HaalaaN_k chooN_k jab_k

اختتامیہ:

ہر انسانی کوشش کی طرح رومن اردو کا یہ نظام تحریر بھی حرف آخر کا حکم نہیں رکھتا ہے۔ راقم الحروف انٹرنیٹ پر بہت سی اردو محفلوں میں سرگرمی سے حصہ لیتا ہے۔ وہیں یہ احساس ہوا کہ رومن اردو کی کتابت کے لیے ایک ٹکسالی نظام کی سخت ضرورت ہے۔ یہ نظام اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ یہاں جو نظام پیش کیا گیا ہے وہ ایک بہت مشکل مسئلے کا ایک آسان، کم و بیش جامع اور عام فہم حل پیش کرتا ہے۔ اس پر عمل اردو اور رومن اردو کے مابین نقل تحریر (transliteration) کو آسان بنا دیتا ہے اور یہی اس کاوش کا سب سے بڑا مقصد بھی ہے۔ یہاں بیان کردہ اصول اردو املا اور تلفظ کے تمام جزویات پر حاوی نہیں ہیں۔ غور و فکر سے چند ایسی صورتیں ضرور نکل آئیں گی جن کے قوانین یہاں نہیں دیے جا سکے ہیں۔ لیکن راقم الحروف کی رائے میں یہ صورتیں تعداد میں اتنی کم اور اپنے استعمال میں اتنی شاذ ہیں کہ ان کے اصول کا انضباط اہل علم پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ یوں بھی ارباب فکر و نظر سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ اس مقالے کے مشمولات پر ناقدانہ نظر ڈالیں گے اور صحت مند تنقید و تبصرہ کے بعد مجوزہ نظام کو بہتر اور مزید موثر بنانے میں راقم الحروف کی مدد کریں گے۔

Razkada, Civil Lines,
East Amir Nishan,
Aligarh, U.P. 202002

□□□

محمد جہانگیر وارثی

اردو ذریعۂ تعلیم کی اہمیت اور ضرورت

دنیا کے زیادہ تر ماہرینِ تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کی ابتدائی تعلیم صرف مادری زبان میں ہونی چاہیے، کیوں کہ مادری زبان کے ذریعے تعلیم نہایت ہی آسان اور مؤثر انداز میں دی جاسکتی ہے۔ مزید دستور ہند میں ریاستی زبانوں کو تسلیم کرلیا گیا جس کے باعث ہر ریاست کے لوگ اپنی علاقائی زبان کو ترقی دینے کے لیے دل و جان سے لگ گئے، نتیجتاً لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تقسیم ہوگئی اور مقامی زبانوں کے نام سے بعض ریاستوں میں یونیورسٹیاں قائم کر دی گئیں۔ مثلاً پنجاب میں پنجابی یونیورسٹی، آندھرا پردیش میں تیلگو یونیورسٹی، تامل ناڈو میں تامل یونیورسٹی، واردھا میں مہاتما گاندھی انٹرنیشنل ہندی یونیورسٹی اور حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی وغیرہ۔

وقت کا تقاضا ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جائے اور ایک نئی طرزِ فکر کے ساتھ عملی طور پر اسے کامیاب کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر اب بھی ہم نے عملی طور پر کوششیں شروع نہیں کیں تو اس اہم مسئلے پر بحث بے سود ہوکر رہ جائے گی۔ اس ضمن میں بعض اہم تجاویز پیش کی جاسکتی ہیں، جو اس طرح ہیں۔

اردو میں درسی و معیاری کتابوں کی فراہمی:

ہمارے ملک میں وقت پر اردو درسی کتابوں کی دستیابی ممکن نہیں ہو پاتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں میں جہاں کتابوں کی فراوانی ہے وہیں اردو میں ان کا فقدان۔ فقدان سے میرا مطلب یہ بالکل نہیں کہ اردو میں معیاری کتابیں نہیں ہیں یا نہیں لکھی جاسکتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے کبھی اس جانب سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا۔ یہ سچائی ہے کہ جب تک نصابی کتابیں، تعلیمی مواد، ٹیچر ٹریننگ پروگرام بذریعہ اردو میڈیم نہیں ہوں گے تب تک تعلیمی میدان میں آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔ چونکہ تعلیمی بجٹ کا بہت بڑا حصہ تعلیم بذریعۂ مادری زبان کو بڑھاوا دینے پر صرف کیا جاتا ہے تاکہ طلبہ کا معیار بلند ہوسکے۔ این سی ای آر ٹی سے لے کر نیشنل اوپن اسکول تک کی درسی کتابوں کے ترجمے کا کام قومی اردو کونسل نے اپنے ذمے لیا ہے تاکہ ترجمے کا معیار اصل کتابوں کے مساوی ہوسکے اور ساتھ ہی ساتھ کونسل نے دیگر ریاستوں میں بھی درسی کتابوں کی دستیابی کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے تاکہ طلبہ کو تعلیمی سال شروع ہونے سے قبل ہی کتابیں دستیاب ہوجائیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تراجم کے لیے اسکول کے اساتذہ کو مدعو کیا جائے اور نصابی کتابوں کا ترجمہ ایسے اساتذہ کریں جنھیں اپنے مضامین کے ساتھ ساتھ اردو پر بھی خاطر خواہ دسترس ہو۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ترجمے کے بعد کتابوں میں Difficulty level کم ہونے کے بجائے اور بھی زیادہ ہوگیا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مترجمین اردو تو جانتے ہیں لیکن انھیں ان مضامین پر عبور حاصل نہیں ہوتا جن کا انھیں ترجمہ کرنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جو کوششیں قومی اردو کونسل کے ذریعے کی جارہی ہیں انھیں مزید مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔

درسی کتابوں کی نصاب سازی:

کسی بھی ذریعۂ تعلیم میں نصاب سازی کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ تعلیم کا انحصار کافی حد تک اس کے نصاب پر منحصر ہوتا ہے۔ اردو میڈیم تعلیم کے لیے نہ تو حکومت کی جانب سے اور نہ ہی اردو اداروں کی جانب سے کوئی کوشش کی گئی۔ اس نصاب پر ہم آج بھی عمل درآمد کررہے ہیں جو دو دہائی قبل تیار کیا گیا۔ جب کہ دیگر زبانوں میں نصاب کا جائزہ ہر دوسرے یا تیسرے سال لیا جاتا ہے تاکہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ اسے ہم آہنگ کیا جاسکے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو اسکولوں کے نصاب کا کم از کم ہر پانچ سال کے وقفے کے بعد از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور موجودہ سوچ و فکر کے ساتھ اس میں نئے مضامین کو شامل کیا جائے اور جو مضامین وقت کے مطابق نہ ہوں انھیں نصاب میں شامل نہیں کیا جائے۔ نصاب سازی میں دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں میں قابل اور باصلاحیت اساتذہ کو ہی نصاب سازی کے لیے بلایا جائے تاکہ طلبہ کے معیار کو ذہن میں رکھ کر نصاب کو آخری شکل دی جاسکے۔

ادب اطفال کی فراہمی:

بچوں کے لٹریچر کو تیار کرنے سے پہلے اساتذہ کو بچوں کی ذہنی سطح کو پیش نظر رکھنا ہوگا تاکہ بچہ اس ادب کو پڑھنے میں دلچسپی لے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بالکل سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا جائے۔ بچوں کے ادب میں حیرت انگیز کہانیاں، نئی نئی ایجادات کے متعلق چند الجواب اور نئے موضوعات

شامل کیے جائیں۔ ساتھ ہی کتابوں کا سرورق پرکشش ہونا چاہیے۔ ہمارے ملک میں آج بچوں کے لیے اس طرح کے لٹریچر کی کمی ہے۔ ملک کی آبادی کا تقریباً 40فی صد ایسے بچوں پر مشتمل ہے جن کی عمر 15 سال سے کم ہے۔ اس عمر کے بچوں کے لیے ایسے ہی صاف ستھرے لٹریچر کی ضرورت ہے تاکہ بچے پڑھائی میں خود بخود دلچسپی لینے لگیں۔ قومی اردو کونسل نے اس جانب توجہ دی ہے اور بڑی تعداد میں ایسی معلوماتی کتابیں شائع کی ہیں۔ علاوہ ازیں چلڈرن بک ٹرسٹ کی تیار کردہ 125 کتابوں کا اردو ترجمہ بھی کونسل نے شائع کیا ہے جو صوری اور معنوی اعتبار سے پرکشش ہیں۔

بچوں کی تعلیم میں والدین کا کردار:

ماں کی گود بچے کی تربیت و تعلیم کی اولین درسگاہ ہوتی ہے۔ بچے کی نشوونما اور کردار کو اجاگر کرنے میں گھر ہی ابتدائی اسکول کا کام کرتا ہے۔ بچے کا ذہن ایک خالی کیسٹ کی طرح ہوتا ہے جس میں اگر آپ گانا ریکارڈ کرنا چاہیں تو گانا ریکارڈ ہوگا۔ خطبہ ریکارڈ کرنا چاہیں تو وہی ریکارڈ ہوگا۔ سبق ریکارڈ کرنا چاہیں تو سبق ریکارڈ ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح بچوں کو اگر آپ اچھی چیزوں کی طرف راغب کریں گے اور اچھی عادات کی طرف مائل کریں گے تو بچہ وہی سیکھے گا۔ بچوں کے ذہن کو تین چیزیں کافی متاثر کرتی ہیں، والدین کی رہنمائی، استاد کی شفقت اور ماحول کا اثر۔ اگر بچے کی پرورش اچھے ماحول میں ہو رہی ہے تو وہ اچھی ہی باتیں سیکھے گا۔ والدین کا یہ فرض ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے کھانے، صحت، پڑھائی اور کھیل کا دھیان رکھیں۔ ان کا ہوم ورک خود اپنے سامنے کرائیں۔ روزانہ اسکول کی ڈائری چیک کریں۔ بچوں کو ان کی خامیاں بتائیں اور اسے دور کرنے کی کوشش کریں اور کم از کم ہفتے میں ایک دن اسکول جا کر استاد سے بچے کے متعلق جانکاری حاصل کریں۔ اکثر والدین بچوں کو ٹیوشن کے لیے کسی استاد کا انتظام کر دیتے ہیں اور یہ سوچ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ان کی ساری ذمے داری ختم ہوگئی۔ اس سے بچوں کی تعلیم و تربیت پر برا اثر پڑتا ہے۔

آج کل تعلیم نسواں ہمارے سماج کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس لیے لڑکیوں کی تعلیم پر خاطر خواہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ نیشنل اوپن اسکول کے ذریعے چلائے جارہے تین کورسیز ہمارے لیے کافی اہم ہیں جنھیں مزید مستحکم کرنے کی ضرورت ہے اور حال ہی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے پورے ملک میں نئے سینٹر قائم کیے جارہے ہیں جہاں بارھویں، جماعت تک امتحان دینے کی سہولت فراہم ہے۔ اس طرح ہمارے معاشرے میں پردہ کرنے والی لڑکیاں بھی اپنے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھ سکتی ہیں۔

تربیت یافتہ اساتذہ کی ضرورت:

کسی بھی میڈیم کے اسکول میں تعلیم کے معیار کا دارومدار بالخصوص اساتذہ کی صلاحیت اور کارکردگی پر منحصر ہوتا ہے، بالفاظ دیگر تعلیم و تربیت کا بہترین نظام تربیت یافتہ اور باشعور اساتذہ کی عدم موجودگی میں ممکن ہی نہیں۔ اچھی تعلیم سے مراد بچوں کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی، ثقافتی اور روحانی نشوونما ہے۔ کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن میں اس کی وضاحت صاف طور پر کر دی گئی ہے کہ ''اچھی سے اچھی اسکیمیں ناکام ہوجائیں گی اگر ان اسکیموں پر عمل درآمد کرنے میں تربیت یافتہ ٹیچر نہ ہوں یا پھر اس میں دلچسپی نہ لیں۔ اس کے باوجود ایک ناقص اسکیم بھی ضرور کامیاب ہوگی اگر اساتذہ اچھے ہوں اور اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہوں۔'' لیکن ہمارے ملک میں اردو میڈیم اساتذہ کے لیے کوئی ٹریننگ پروگرام نہیں ہے۔

ضروری ہے کہ ہم ٹیچر ٹریننگ پروگراموں کی جانب توجہ دیں۔ جہاں جہاں ٹریننگ کی سہولتیں فراہم ہیں وہاں اردو میڈیم اساتذہ کے لیے بھی ٹریننگ کی سہولتیں فراہم کرائی جائیں۔ جہاں جہاں اکیڈمک اسٹاف کالج ہیں وہاں پر اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ کے لیے بھی Orientation Course چلائے جانے چاہئیں تاکہ یہ اساتذہ بھی نئی تعلیمی پالیسی اور تجاویز سے ہم آہنگ ہوسکیں۔

تکنیکی تعلیم کی ضرورت:

آج کے پس منظر میں اگر تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ تعلیم برائے معاش کی طرف لوگوں کا رجحان زیادہ ہے۔ تعلیم برائے معاش یا روزگار سے مطلب یہ ہے کہ وہ تعلیم جسے مکمل کرنے کے بعد طلبہ کو روزگار کے مواقع زیادہ سے زیادہ میسر آئیں۔ ایک مغربی اسکالر نے کہا ہے کہ ''اگر کسی قوم کو برباد کرنا ہو تو اس قوم کے تعلیمی مزاج و معیار کو برباد کر دیا جائے، قوم خود بخود برباد ہو جائے گی۔''

ضرورت ہے کہ اردو تعلیم کو روزگار سے جوڑا جائے اور اس میں نئے نئے کورسیز شروع کیے جائیں۔ مثلاً کمپیوٹر کورس، صحافت کورس اور ٹرانسلیشن کورس وغیرہ۔ جب زبان سماج سے جڑے گی، نئی فکر اور ٹیکنالوجی سے وابستہ ہوگی تو روزگار کے بھی مواقع فراہم ہوں گے۔

(بشکریہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی، 28 جنوری 2005)

□□□

عارف عزیز

اردو صحافت : مسائل اور امکانات

پرانے زمانے میں شعر و ادب کے وسیلے سے حالاتِ حاضرہ کی سرگرمیوں کو محفوظ کیا جاتا تھا، تقریباً پونے دو سو سال پہلے ہندستان میں اردو صحافت کا آغاز ہوا تو یہ کام اخبارات کے ذریعے ہونے لگا اور بیسویں صدی کے آخر میں اس کی جگہ الیکٹرانک میڈیا کا حلقۂ اثر بڑھنے کے باوجود پرنٹ میڈیا کی اہمیت آج بھی مسلم ہے، بالخصوص ہندستان میں جہاں انگریزی، ہندی، بنگلہ اور تمل صحافت کا اہم حصہ ہے وہیں اردو صحافت نے بھی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ اردو صحافت کا جو اثر و رسوخ آزادی سے قبل اور اُس کے بعد قائم تھا، آج اس میں کافی کمی آگئی ہے جس کے لیے اپنے اور پرائے دونوں ذمّے دار ہیں۔ جہاں اردو دشمنوں نے اردو زبان کی بیخ کنی کو اپنا مقصدِ عین بنایا وہیں اردو حلقوں نے بھی اپنی زبان و تہذیب سے بے اعتنائی برتی اور نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ شمالی ہند جہاں کبھی اردو صحافت کی بہار آئی ہوئی تھی آج خزاں رسیدہ نظر آتا ہے۔ اردو کے بیشتر اخبارات بند ہوگئے ہیں جو باقی ہیں وہ بھی اپنے وجود کے لیے جدو جہد میں مصروف ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو ہندستان کی تقسیم اور اس کی ذمّے داری اردو زبان پر ڈالنے کی فرسودہ ذہنیت ہے، جس نے زبان کو کافی نقصان پہنچایا۔ دوسرے خود اہلِ اردو کی تساہلی اور غیر ذمّے داری ہے، جس کے اثرات دوسرے شعبوں کی طرح اردو صحافت پر بھی مرتب ہو رہے ہیں، پھر بھی حیدرآباد، ممبئی، دہلی، بنگلور اور کولکاتہ کے اردو اخبارات کو دیکھ کر مایوسی و بے کیفی کی یہ فضا کافی چھٹ جاتی ہے اور یہ امید قائم ہوتی ہے کہ اردو صحافت نے لیتھو کے دور سے روٹری کے عہد میں جس طرح قدم رکھا یا کتابت سے پیچھا چھڑا کر کمپیوٹر کے عہد میں آج سانس لے رہی ہے، اُسی طرح اس کا موجودہ حال بھی ضرور تبدیل ہوگا۔ لگ بھگ آٹھ دس سال پہلے مرکزی وزیر کی حیثیت سے مادھوراؤ سندھیا نے صحافت کے میدان میں اردو کی پسپائی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ”جس زبان کے بولنے والے حالات کے تقاضے پر کھرے نہیں اُترتے وہ خطرے میں پڑ جاتی ہے، اردو زبان اور اُس کی صحافت سے نئی نسل کی عدم دلچسپی کا سبب یہی ہے کہ اخبارات نے جدید کاری کے عمل کو اہمیت نہیں دی۔“

یہ حقیقت ہے کہ شمالی ہند میں اردو اخبارات اپنی اس کوتاہی کا آج نتیجہ بھگت رہے ہیں، اس کے برعکس انگلیوں پر گنے جانے والے جنوبی ہند کے اردو اخبارات کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اُن کی انتظامیہ نے وقت کی نبض کو پہچان کر جدید وسائل اختیار کیے لہٰذا یہ آج دوسری زبان کے اخبارات سے آنکھیں چار کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

جس طرح برصغیر میں اردو کی ترقی و توسیع میں بنیادی حصہ اردو کے اخبارات و رسائل کا ہے، اسی طرح پوری دنیا میں اردو کو مقبول بنانے میں ان کا اہم کردار ہے لیکن عام طور پر کھلے دل سے اس کا اعتراف نہیں کیا جاتا، حالانکہ یہ اردو اخبارات ہی ہیں جنھوں نے اردو کو بیسویں صدی کی زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور نئے الفاظ، اصطلاحات اور محاوروں کو رواج دیا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے عام ہونے کے باوجود اخبارات کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے، اُن کی طاقت و اثر کا راز یہ ہے کہ وہ رائے عامہ بناتے اور دماغ پر کنٹرول کر کے دلوں کو بیدار کرتے ہیں۔ ”دعوت“، ”الجمیعت“ اور ”قومی آواز“ کو گھاٹے کا سودا ثابت ہونے کے باوجود اسی لیے نکالا جا رہا ہے کہ اُن سے وابستہ جماعتوں کی آواز ملک کے مختلف گوشوں میں پہنچتی رہے۔

برِصغیر میں اردو کی ترویج و اشاعت میں اردو اخبارات و رسائل کا اہم حصہ ہے۔ اس زبان کو پوری دنیا میں مقبول بنانے، نئے علاقوں میں اس کی بستیاں بسانے اور اردو فنکاروں کو پوری دنیا سے متعارف کرانے میں اردو اخبارات و رسائل بنیادی کردار انجام دے رہے ہیں مگر اردو کے ادارے بشمول اردو اکادمیاں، اردو صحافت کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتیں۔ دلّی اردو اکادمی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جیسے کچھ ادارے مستثنیٰ ہیں، تاہم بحیثیتِ مجموعی یہی صورت حال ہے۔

اردو کا پہلا اخبار ”جامِ جہاں نُما“ 1822 میں کلکتے سے شائع ہوا تھا، اس لحاظ سے اردو صحافت کے 183 سال مکمل ہو رہے ہیں۔ اس مدت میں اردو صحافت کئی طوفانوں سے دو چار ہوئی، کئی نشیب و فراز دیکھے، متعدد انقلابات کو اس نے اپنے دامن میں جگہ دی، کیا ہی اچھا ہو کہ اردو صحافت کے اس طویل سفر پر قومی سطح سے ریاستی سطح تک پروگرام مرتب کیے جائیں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو ایڈیٹرس کانفرنس، انجمن ترقی اردو، ریاستی اردو اکادمیاں، وزارتِ فروغ انسانی وسائل، محکمہ اطلاعات و نشریات کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جائے۔ سیمنار ہوں، کتابوں کی اشاعت ہو، اور اخبارات و رسائل کے خصوصی شمارے شائع کیے جائیں، جن میں اردو صحافت کے ولولہ انگیز کردار کی عکاسی کی جائے اور مستقبل کے لائحۂ عمل پر بھی گفتگو ہو۔ وزارتِ مواصلات سے ایک یادگار ڈاک ٹکٹ کے اجرا کی اپیل کی جائے اور اس موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی بھی تحسین کی جائے جس نے یو این آئی کی اردو سروس کو زندہ رکھنے اور اردو روزناموں کے لیے اُس کو سہل الحصول بنانے کے مقصد سے سبسڈی کی فراہمی کا طریقہ اپنایا جو آٹھ دس

برس سے جاری ہے۔

ہندستان میں جہاں اردو صحافت کا ایک تابناک ماضی رہا ہے اور آج بھی اردو اخبارات تعداد کے لحاظ سے ہندی کے بعد سب سے زیادہ نکلتے ہیں، اردو اخبارات و رسائل کے لیے کوئی مخصوص لائبریری نہیں ہے۔ حیات اللہ انصاری کے بقول ملک کے بعض اہم مسائل وموضوعات کا مطالعہ بہتر طور پر اردو اخبارات سے ہی ہوسکتا ہے مثلاً دوقومی نظریہ، پنجابی صوبے کے بارے میں مباحثہ اور اردو کے حقوق کے لیے تحریکات پر اردو اخبارات ہی صحیح معنوں میں روشنی ڈال سکتے ہیں لہٰذا لائبریری یا اخبارات کے میوزیم کے قیام کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

کیرل، ناگالینڈ اور اروناچل جیسی دوردراز کی ریاستوں کے سوا ملک کے سبھی حصوں سے اردو اخبارات و رسائل منظر عام پر آرہے ہیں، اس میں روزنامے، ہفت روزہ، ماہنامے اور سہ ماہی سبھی شامل ہیں لیکن اس پھیلاؤ کے باوجود اردو اخبارات و جرائد کو درپیش مسائل میں اُن کی روبہ زوال تعداد اشاعت سرفہرست ہے۔ ملک کے چھ سات روزناموں کے سوا کسی اخبار کی اشاعت 5ہزار تک نہیں پہنچتی۔ اگر اردو اخبارات و رسائل کی اشاعت میں توسیع مقصود ہے تو اس کے لیے سب سے پہلے اردو کی تعلیم پر توجہ دینا ہوگا تاکہ پرائمری سے اعلا سطح تک اردو تعلیم کا بول بالا ہو، نئی نسل اس زبان کی مزاج داں بنے۔ اس کے ساتھ اردو کے اخبارات عوام میں مقبول بنانے کے لیے خبروں، تبصروں اور رپورٹوں کے معیار کو بہتر بنایا جائے تاکہ قارئین میں اخبار کے لیے کشش و رغبت پیدا ہو۔ آج اردو صحافت ہندی، انگریزی اور علاقائی زبانوں کے مقابلے میں پسماندہ ہے۔ اس کے اسباب وعلل کو تلاش کرکے جب تک اُن کا انسداد نہیں ہوگا، اردو صحافت کا منظرنامہ خوشگوار نہیں ہوگا۔

عام طور سے اردو کے ایڈیٹر کو وہ مشاہرہ نہیں ملتا جو دوسری زبانوں کے اخبارات کے ایڈیٹروں کو ملتا ہے۔ اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو صحافت میں تربیت یافتہ عملے کا بھی فقدان ہے، حالانکہ موجودہ عہد کو مہارت کا دور کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی پیشہ ہو جب تک اُس میں نئی وسعتوں کو نہیں چھوا جائے گا وہ ترقی سے محروم رہے گا۔ اگر تربیت یافتہ صحافی اردو صحافت کو میسر آجائیں تو اس کی ترقی کے لیے راہیں ہموار ہوسکتی ہیں۔

اردو صحافت کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ قومی جذبے کے ساتھ قارئین کی ضرورت، پیشہ ورانہ مہارت اور تجارتی تقاضوں کو اولیت دی جائے۔ جنوبی ہند کے اخبارات نے اس کی اہمیت کو سمجھا تو آج وہاں سے کئی بڑے اردو اخبار شائع ہورہے ہیں۔ ایک تجارتی گروپ نے دلی ولکھنؤ سے اردو روزنامہ نکالنے کی جرأت کی تو مختصر عرصے میں اُس نے قارئین کی بڑی تعداد کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر سلیقے سے اردو اخبار کا اجرا ہو تو ناسازگار حالت میں بھی وہ مقبول ہوسکتا ہے، ایسے معیاری اخباروں کو اشتہارات کے حصول میں بھی دقت پیش نہیں آئے گی، جو اخبارات کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اشتہارات، جس کے دو ذرائع ہیں اوّل سرکاری، دوم تجارتی، سرکاری اشتہارات مرکزی وریاستی حکومتوں کے علاوہ لوکل باڈیز سے بھی ملتے ہیں ان اشتہارات میں مسلسل کمی آرہی ہے۔ اقتصادیات کی نرم روی سے پبلک سیکٹر کا دائرہ دن بدن محدود ہورہا ہے لہٰذا تجارتی اشتہارات ہی مستقبل میں اخبارات کے ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوں گے اور یہ زبانی دعوے یا جعلی سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر نہیں ملتے بلکہ جس اخبار کا جتنا سرکولیشن ہوگا اسی تناسب سے وہ اشتہار پائے گا۔ اردو اخبار انھیں حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پہلے انھیں تعداد اشاعت میں اضافہ کرنا ہوگا۔

معاشیات کا پہلا اصول ہے کہ جیسی مانگ ویسی کھپت، اگر اردو کا اخبار سستے کاغذ، گھٹیا طباعت اور غیر معیاری مواد کے ساتھ قارئین تک پہنچے گا تو اُس کو خریدنا کون چاہے گا۔ آج اخبار بھی ایک انڈسٹری بن گیا ہے، جسے تجارتی اصولوں پر نکال کر خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس تجارت میں اگر جذبہ بھی شامل ہو تو کیا کہنے۔ ورنہ محض شوق و جذبے سے اردو اخبار کی اشاعت مفید ثابت نہیں ہوسکتی۔ دوسری زبانوں کی طرح اُردو صحافت اور اُس کے اخبارات کے لیے آج ترقی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ نئی نسل سے اردو کا رشتہ کمزور پڑنے کے باوجود نوجوان آج بھی معیاری اخباروں کا مطالعہ کرتے ہیں، جس کا ثبوت ہندستان کے مختلف شہروں سے منظر عام پر آنے والے بڑے اخبارات کی اشاعت وترسیل سے ملتا ہے، پاکستان کی صحافت میں تو اردو اخبارات کا پیش رو ہونا کسی دلیل وثبوت کا محتاج نہیں، اس کے مقابلے میں شمالی ہند کے بعض اخبارات کو دیکھ کر بیل گاڑی اور جیٹ کا فاصلہ نظر آتا ہے۔ یہ فاصلہ اردو اخبارات ہی طے کرسکتے ہیں یا پھر جرم ضعیفی کی سزا کے طور پر مرگِ مفاجات کے لیے انھیں تیار رہنا چاہیے۔ اب اس کھوکھلی رجائیت سے فائدہ نہیں پہنچے گا کہ اردو زبان بڑی جاندار ہے اور اُس کا رسم خط اتنا سائنٹفک ہے کہ طوفان حوادث کے درمیان اپنی کشتی کو آگے بڑھاتا رہے گا، اس مشینی عہد میں وہ چیزیں باقی نہیں رہتیں جن کی معاشی و معاشرتی اہمیت قائم نہ رہے۔ اس تہذیب کے مزاج میں تیزگامی کے ساتھ سفاکی بھی شامل ہے۔ جب پہلی مرتبہ کپڑا بُننے کی مشین ایجاد ہوئی تو یہ نہیں سوچا گیا تھا کہ اُن کاریگروں کا کیا ہوگا جو ہاتھ سے کپڑا بُن کر روزی کماتے ہیں۔ اس طرح کے رویے کا مشاہدہ کاتبوں کے ساتھ بھی ہوا کہ کمپیوٹر کا عمل دخل شروع ہوتے ہی اُن کا وجود بے معنی سمجھ لیا گیا، یہ مثالیں خدا نہ کرے کہ کبھی اردو صحافت پر صادق آئیں۔

20, Ghati Bharbhunja Road,
Taliya, Bhopal-462001

□□□

مدن لال کپور

پبلو نرودا — شاعری کا پکاسو

پبلو نرودا لاطینی امریکا کے ملک چلی کے عظیم قومی شاعر تھے، لیکن ان کے احساسات کی دنیا کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ ہر پسماندہ ملک اور معاشرہ ان کو اپنا شاعر سمجھنے لگا۔ ان دنوں ان کی ولادت کی صدی کئی ممالک میں منائی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں کئی تقریبات منعقد کی جا رہی ہیں۔ نرودا کو ہندستانی ادب کے رجحانات اور ہندستانی معاشرے کے مسائل میں کافی دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کا سبب چلی اور ہندستان کی معاشی پسماندگی اور دونوں ملکوں کا غیر مساواتی نظام تھا۔ وہ ہندستان میں تین بار تشریف لائے۔ 1928 میں وہ کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں حاضر ہوئے۔ جہاں ان کی ملاقات مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ 1951 میں وہ ہندستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کو 'پیغام امن' پیش کرنے کے لیے آئے تھے۔ 1957 میں مشہور بنگالی شاعر بشنو ڈے کی دعوت پر وہ ہندستان تشریف لائے۔ ان کی تخلیقات کا ترجمہ ہندی، بنگالی اور ملیالم وغیرہ ہندستانی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ پچاس کی دہائی میں اردو ادب کے موقر ادبی ماہنامے 'شاہراہ' نے ان کی شخصیت اور شاعری پر ایک فکر انگیز مقالہ شائع کر کے اردو ادب کے قارئین کو ان سے متعارف کرایا تھا۔ پبلو نرودا کی پیدائش 1904 میں جنوبی چلی میں پرال کے مقام پر ہوئی۔ ان کے والد چلی ریلوے میں بحیثیت فورمین کام کرتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں نرودا نے شعر کہنے شروع کیے اور چار سال کے قلیل عرصے میں انھوں نے اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ بعنوان "بیس عشقیہ نظمیں اور مایوسی کا نغمہ" شائع کیا جو عشاق کے لیے نادر تحفہ تھا۔ ہسپانوی زبان بولنے والے ابھی تک اپنی محبت اور عشق کے اظہار کے لیے ان نظموں کا سہارا لیتے ہیں جو بیس سال کی عمر میں نرودا نے لکھی تھیں۔ یہ بیس سال کا نوجوان جب اپنی عمر کی 67 منزلیں طے کر چکا تو وہ 1971 میں ادب کی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز نوبل پرائز حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ بیس عشقیہ نظموں، سے نوبل پرائز تک کا سفر نرودا نے اپنی شاعرانہ صلاحیت اور اپنے بیدار سماجی شعور کے بل بوتے پر طے کیا۔

اکثر لاطینی امریکی ملکوں کی طرح چلی میں بھی اپنے شعرا اور ادیبوں کو اعزاز دینے کا طریقہ ان کو سفارتی ملازمتوں سے نوازنا ہے۔ 23 سال کی عمر میں نرودا کی رنگون میں چلی کے سفارت خانے میں تقرری کی گئی۔ اگلے پانچ سال انھوں نے جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں گزارے۔ اس دوران ان میں تنہائی کا احساس بڑھتا گیا اور وہ ایشیائی شہری زندگی سے اسی طرح بیزار ہو گئے جس طرح وہ چلی کی شہری زندگی سے اُوب گئے تھے۔ یہ بیزاری ان کی شاعری میں نئی علامتوں اور استعاروں کی صورت میں ابھر کر سامنے آئی۔ وہ سرریلزم سے متاثر ہوئے اور ان کی شاعری میں ابہام کا اضافہ ہوا۔ وہ شاعری کے پکاسو تصور کیے جانے لگے۔ پبلو پکاسو اور پبلو نرودا کی مماثلت ان کی باطنی تشویش اور زندگی کی بے معنویت سے بیزاری تھی۔ جو پکاسو کے رنگوں اور مکعبی مصوری میں ابھر کر ہمیں مسحور کر گئی اور نرودا کے لفظوں اور استعاروں کے آہنگ کی تاثیر بن کر ہمارے احساسات پر چھا گئی۔ اس کے علاوہ اسپین کی خانہ جنگی سے یہ دونوں فنکار بڑی شدت سے متاثر ہوئے۔ پبلو پکاسو کی مشہور تصویر 'گیورنیکا' اس جنگ کی ہیبت ناکیوں کی عکاسی کرتی ہے اور پبلو نرودا کی شہرہ آفاق نظم" اسپین میرے دل میں" فاشسٹ طاقتوں کے مظالم کو پیش کرتی ہے۔

پبلو نرودا کی زندگی اور شاعری کا سب سے بڑا موڑ ان کا 1934 میں میڈرڈ سفارت خانے میں تبادلہ تھا۔ اسی دوران اسپین میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ ان کے دوست اور عظیم شاعر فیڈریکو گرسیا لورسا کا قتل ہوا۔ ان واقعات نے ان کے " باطنیت" کے رجحان کو پاش پاش کر دیا۔ ان کے نظریات اور احساسات کا دوسرا جنم ہوا۔ وہ رومانی نراجی سے اشتراکی ہو گئے۔ اپنی ایک نظم میں یوں کہتے ہیں: تم پوچھو گے، اس کی شاعری خوابوں اور پیڑوں کے پتوں کی باتیں نہیں کرتی...... آؤ اور دیکھو سڑکوں اور گلیوں میں خون۔" آؤ اور دیکھو سڑکوں اور گلیوں میں خون" ان کی کمیٹیڈ شاعری یعنی مقصد کی پابند اور ترغیبی نظموں کا مجموعہ 1937 میں شائع ہوا۔ یہ نظمیں ابہام اور باطنیت سے مبرا تھیں۔ ان میں جوش تھا۔ عوامی جدو جہد کی حرارت تھی اور انقلاب کے آگ کی لپٹیں تھیں، ان نظموں نے نرودا کو لاطینی امریکا کے عوام کے نزدیک کر دیا۔ وہ شاعر کے علاوہ فاشزم کے خلاف جمہوریت پسند طاقتوں کی صف بندی کے سرگرم رکن بن گئے۔ ہسپانوی سول وار کے دنوں میں وہ ری پبلکن محاذ کی حمایت کرتے رہے۔ فرانس اور چلی میں اس کے لیے سرگرم رہے۔ یورپ کے دوسرے ممالک کا بھی دورہ کیا۔ ہسپانوی رفیوجیوں کو چلی لانے اور ان کو آباد کرنے میں مصروف رہے۔ 1945 میں وہ میکسیکو میں چلی کے کونسل جنرل مقرر ہوئے۔ 1943 میں جب وہ چلی لوٹے تو یہ ان کا فاتحانہ سفر تھا۔ لاطینی ممالک کے دارالخلافوں میں ان کا شاندار استقبال ہوا۔ عوام نے ان کو سر

آنکھوں پر بٹھایا۔ان کے دیدار کے لیے لاطینی امریکی عوام جوق در جوق اکٹھے ہوئے۔ کیونکہ نرودا نے ان کے مصائب اور ان کے حوصلوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا۔ چلی میں اپنی واپسی کے بعد نرودا اپنے Memoirs یعنی' یادداشتوں کی کتاب' میں یوں رقمطراز ہیں:

"1943 کے اختتام میں ایک بار پھر سن تیاگو (چلی) لوٹا۔ایک بار پھر میں اپنے وطن کی خوبصورتی، اس کے خواتین کے حسن، اس کی پر شکوہ قدرت اور اپنے ہم وطنوں کی قدرتی ذہانت سے متعارف ہوا.....میرا ملک بدلا نہیں تھا۔ وہی کھیت اور نیند میں اونگھتے ہوئے گاؤں...دل شکن مفلسی اور اس کے برعکس کنٹری کلبوں میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے چاق و چوبند لوگ۔ اب مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ایک راستے کا انتخاب کرنا تھا۔کرزیو مالپارتے نے مجھ سے انٹرویو کے بعد لکھا:" میں (کرزیو) کیمونسٹ نہیں ہوں۔لیکن اگر میں چلی کا شاعر ہوتا،تو میں پبلو نرودا کی طرح ہوتا۔ مجھے جانبدار ہونا پڑتا۔کیڈیلاک کار کے مالکوں کا یا ان لوگوں کا جو کبھی اسکول نہیں گئے تھے اور جو جوتے پہننے سے محروم رہے تھے"۔ نرودا نے ننگے پاؤں چلنے والے عوام کا ساتھ دیا۔ اور اسکول کے دروازے تک نہ پہنچ سکنے والے عوام نے 4/مارچ 1945 کے دن نرودا کو چلی کی سینٹ کا ممبر منتخب کیا۔

جبریل گرسیا مارکیز نے نرودا کو بیسویں صدی کا عظیم شاعر قرار دیا ہے لیکن اکٹیویو پاز نے نرودا کو ایک عظیم لیکن خطرناک شاعر کہا ہے، کیونکہ اس کی شاعری کے الفاظ، استعارے اور علامتیں ایک بوچھار کی صورت میں اپنے قاری کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہیں۔ پاز آزادی بغیر تشدد کے قائل تھے لیکن نرودا کا محنت کش طبقے کی سادگی اور ان کی قوت میں پورا یقین تھا...... اس قوت کا جو کارخانوں میں چائے نہ ملنے پر بھڑک اٹھتی تھی۔ ان محنت کشوں کا صرف یہ کہنا تھا۔" اگر ہمیں پینے کے لیے چائے نہیں ملتی تو ہمارے سروں میں شدید درد پیدا ہو جاتا ہے۔"نرودا کی تمام تخلیقی قوتیں اپنے ملک کے ان عوام کے لیے مخصوص تھیں جو جوتے پہننے سے محروم تھے یا ایک پیالی چائے نہ ملنے پر بھڑک اٹھتے تھے۔

نرودا کی ولادت کی صدی میں ہندستانی اخبارات اور رسائل میں جو مضامین شائع ہو رہے ہیں، ان میں سے ہندستان میں چلی کے سفیر جناب جارج ہین کا مضمون ہے اور دوسرا مضمون مشہور کالم نگار، دانشور اور ادیب جناب ششی تھرور کا، قابل ذکر ہیں۔ جناب ہین کے مطابق نرودا کو زندگی کی معمولی اور سیدھی سادی اشیا سے والہانہ محبت تھی۔ جب وہ عشق اور محبت کے بارے میں شعر کہتے تھے تو وہ اپنی محبوبہ کی خوبصورت رانوں اور سینے کا ذکر کرتے تھے۔ اس کے جسم کی خوبصورتی کو اپنی شاعری کے حسن کا حصہ بنا لیتے تھے۔ جب وہ جنوبی امریکا کے عوام کے بارے میں لکھتے تھے تو وہاں کی معدنیات اور آتش فشاں پہاڑوں کو اپنی شاعری سے الگ نہیں کر پاتے تھے..... وہ اپنی شاعری میں کسی تجریدی یا مابعد الطبعیاتی فکر کے قائل نہیں تھے۔ گرسیو لورسا نے بڑے خوبصورت انداز سے نرودا کی شاعری کا جائزہ ایک جملے میں پیش کیا ہے:" وہ روشنائی کے مقابلے میں لہو کے زیادہ قریب ہیں" (Closer to Blood than to ink)۔ اس انفرادیت نے ان کو چلی کے عوام کا عظیم شاعر بنا دیا۔ ان کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں خریدی اور پڑھی گئیں۔ وہ انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعر ہیں (جارج ہین ۔ ہندو 15/جولائی 2004 ششی تھرور لکھتے ہیں: "نرودا کی علالت کے دنوں میں امریکی سازش کے تحت الندے کی سرکار کو گرا دیا گیا۔ جب ایک فوجی نرودا کے بیڈ روم میں ان کو نظر بند کرنے کے لیے داخل ہوا تو انھوں نے پر جوش انداز میں کہا۔" اس کمرے میں ایک ہی چیز سے تمھیں خطرہ ہے اور وہ ہے میری شاعری"۔ الندے کی جمہوری سرکار کے زوال کے ٹھیک بارہ دن بعد پابلو نرودا کا 1973 میں انتقال ہو گیا۔

(بشکریہ "قومی آواز"، نئی دہلی، 8/اگست 2004)

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں

مصنف: راجندر اوستھی/مترجم: عبدالغفار خاں

خان عبدالغفار خاں کی زندگی طوفانوں کی تاریخ ہے۔ ہندستان کی جنگِ آزادی سے لے کر پاکستان کے قیام کے بعد تک وہ پختونوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف غریبوں اور مظلوموں کی لڑائی لڑتے رہے اور اس لڑائی میں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزرا۔ سرحدی گاندھی کے حالاتِ زندگی سے واقفیت کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات: 78، قیمت:-/21 روپے

تین زنگ نورگے

مصنف: درگا پرشاد شکل/مترجم: جہاں آرا

تین زنگ نورگے اور ایڈمنڈ ہلیری کوہ پیمائی کی تاریخ کے روشن باب ہیں۔ زیر نظر کتاب میں تین زنگ نورگے کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ایوریسٹ کی چوٹی سر کرنے کی مہم کی پوری تفصیل درج ہے۔

طلبہ کے لیے ایک بے حد معلوماتی کتاب۔

صفحات: 87، قیمت:-/21 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

تحریر: جگدیپ سکسینہ
ترجمہ: نجمہ نقوی

پٹرول کو الوداع

پٹرول اور ڈیزل کی قیمتوں میں لگاتار ہونے والا اضافہ نہ تو تعجب خیز ہے اور نہ ہی باعثِ حیرت، چونکہ آج کچے تیل کی حالت ایک انار سو بیمار، والی ہوگئی ہے۔ دراصل چند ممالک ہی کچا تیل پیدا کرتے ہیں، اور دنیا کے زیادہ تر ممالک میں اس کی مانگ تیزی سے بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں قیمتوں میں اضافہ ہونا فطری بات ہے۔ دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کنوؤں کی شکل میں تیل کے یہ ذخائر بہت محدود ہیں۔ ایک نہ ایک دن ان کا خشک ہوجانا طے ہے، اور یہ منحوس دن اتنی ہی تیزی سے ہمارے قریب آتا جارہا ہے، جتنی تیزی سے کچے تیل کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ اس لیے دنیا کے عظیم ممالک ان ذخائر پر اپنا قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ اس مصیبت کے مدِنظر آج ہندستان سمیت پوری دنیا میں پٹرولیم کے موثر متبادل کی زور وشور سے تلاش جاری ہے۔

'ایندھن کنگ' بننے کی دوڑ میں فی الحال سب سے آگے ہائیڈروجن کا نام ہے۔ ہائیڈروجن یوں تو ہماری آب و ہوا میں زبردست طور پر گھلی ہوئی ہے، لیکن اسے الگ کرنا اور ایندھن کے طور پر استعمال کرنا آسان نہیں ہے۔ آگ سے قریبی رشتہ رکھنے والی اس گیس کو محفوظ ذخیرے کی شکل میں رکھنا ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس کی پیداواری لاگت بھی فی الحال زیادہ ہے۔ ان چیلنجوں کے باوجود بی ایم ڈبلیو اور مازدہ جیسی اہم کار کمپنیوں نے ہائیڈروجن کے دم پر چلنے والی موٹر گاڑیاں بنائی ہیں اور وہ سڑکوں پر فراٹے بھی بھر رہی ہیں۔ لیکن بڑے پیمانے پر ان کی موجودگی اب بھی ایک مسئلہ ہے۔ کچھ عرصے قبل ہائیڈروجن کو مستقبل کا ایندھن مانتے ہوئے امریکی سرکار نے ایک بڑا منصوبہ شروع کیا ہے۔ اس کے تحت امید ہے کہ 2020 تک امریکہ میں ہائیڈروجن سے چلنے والی موٹر گاڑیاں عام طور پر دکھائی دینے لگیں گی۔ جہاں تک بھارت میں ہائیڈروجن سے چلنے والی گاڑیوں کی بات ہے، بنارس ہندو یونیورسٹی کے سائنسدانوں نے ہائیڈروجن سے چلنے والی موٹر بائیک بنا کر دنیا کو حیرت زدہ کردیا ہے۔ اسے کمرشیل طور پر بنانے کی تیاری چل رہی ہے۔ ہائیڈروجن کا استعمال کرنے والی تین پہیوں کی گاڑیاں بھی بنائی جاچکی ہیں۔ ساتھ ہی کمرشیل طور پر ہائیڈروجن کی پیداوار کی کوششیں جاری ہیں۔ ایندھن کے طور پر ہائیڈروجن کے استعمال کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے آلودگی تقریباً ختم ہوجاتی ہے۔ غور طلب ہے کہ پٹرول ڈیزل سے ہوا میں گھلنے والا زہر آج دنیا میں تشویش کا باعث ہے۔ زمین کی آب و ہوا کو تباہ کرنے کے اندیشے والے گرین ہاؤس گیسوں کے پیچھے پٹرول ڈیزل کی آلودگی کا زبردست ہاتھ بتایا جاتا ہے۔

حال ہی میں پٹرولیم کے متبادل کے طور پر بایوڈیزل بھی تیزی سے ابھرا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، "بایوڈیزل" پیڑ پودوں سے حاصل ہونے والا تیل ہے، جسے ڈیزل انجن میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بایوڈیزل پر تحقیق کے ابتدائی دور میں ارنڈی، سورج مکھی، ناریل، سویابین، زیتون، ہولا اور تاڑ جیسی تلہنی فصلوں کے تیل ڈیزل ایندھن میں آزمائے گئے اور کامیاب بھی رہے۔ ان کے ساتھ کچھ تکنیکی مسائل کے علاوہ اونچی قیمتوں کا چیلنج بھی تھا۔ لیکن جلد ہی سائنسدانوں نے جٹ روفا نامی جنگلی پودے کے بیج سے ملنے والے تیل کو ڈیزل کی جگہ لاکر دیگر تیلوں کے چیلنج کو ختم کردیا۔ آج جٹ روفا کا تیل بایوڈیزل کا ہم معنی بن گیا ہے۔ اس کے بیجوں سے ملنے والے تیل کو ڈیزل میں بدلنے کے لیے ایک خاص کیمیائی عمل سے گزارنا پڑتا ہے، لیکن ڈیزل انجن میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کرنی پڑتی۔ بایوڈیزل کا استعمال ماحولیات کے لیے بھی بہتر ہے، کیونکہ ڈیزل کی بہ نسبت اس سے کاربن ڈائی آکسائڈ کا اخراج تقریباً 80 فیصد کم ہوجاتا ہے، جبکہ سلفر کی غیر موجودگی کے سبب سلفر ڈائی آکسائڈ تو بالکل نہیں بنتا۔

بایوڈیزل کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ملک میں جٹ روفا کی بڑے پیمانے پر کھیتی کرنے کی تیاری چل رہی ہے۔ انڈین ریلوے نے اسے اپنی بنجر زمین میں اگاکر اس کے تیل سے ٹرین چلانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ شتابدی ایکسپریس کو بایوڈیزل سے کامیابی کے ساتھ چلایا جاچکا ہے۔ حال میں دلی کی وزیراعلا شیلا دکشت نے بایوڈیزل سے چلنے والی کار کو ہری جھنڈی دکھائی ہے۔ گاؤں میں بہت سے کسان اس سے ٹریکٹر اور پمپ سیٹ چلانے لگے ہیں۔ اسے مقبول عام بنانے میں اگر کوئی مسئلہ ہے تو وہ ہے بڑے پیمانے پر اس کی عدم فراہمی اور عوام الناس میں بیداری کا فقدان۔ دراصل بایوڈیزل تیار کرنے کے لیے لگائی جانے والی ریفائنری میں ابتدا میں بڑے پیمانے پر سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ اس لیے اس سمت میں حکومت کو پیش قدمی کرنی ہوگی۔ ویسے حال ہی میں ایک ہندستانی کمپنی اور برٹش کمپنی نے مل کر دو مقامات پر بایوڈیزل ریفائنری قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ایک ریفائنری چنئی میں قائم کی جائے گی، جو ہر روز 22 ہزار لیٹر بایوڈیزل تیار کرے گی۔ کمپنی کو امید ہے کہ 2009 تک

50 لاکھ ہیکٹیئر زمین پر جٹ روفا کی کھیتی کی جائے گی۔ تیل کی بڑھتی قیمتوں سے پریشان ممالک میں بایوڈیزل ایک بڑا امکان بن کر ابھرا ہے۔

پیڑ پودوں سے حاصل کرنے والے پٹرولیم متبادلات میں ایتھنال کا نام بھی کافی نمایاں ہے۔ یہ ایک طرح کا الکحل ہے جسے گنے کے شیرے سے بنایا جاتا ہے۔ خالص ایتھنال کو پٹرول کی جگہ استعمال نہیں کیا جاسکتا، برازیل گنا پیدا کرنے والا ایک اہم ملک ہے، یہاں گذشتہ 70 سال سے ایتھنال کو پٹرول میں ملا کر استعمال کیا جارہا ہے۔ شروعات 5 فیصد ایتھنال ملانے سے ہوئی تھی اور آج وہاں پٹرول میں 24 فیصد ایتھنال ملایا جارہا ہے۔ اس سے برازیل میں پٹرول کی مانگ تقریباً ایک چوتھائی کم ہوگئی ہے۔ امریکہ میں ہر سال ڈیڑھ ارب گیلن ایتھنال 10 فیصد کی شرح سے پٹرول میں ملایا جاتا ہے۔ ایتھنال ملا ہوا پٹرول ماحولیات کو بہتر بنانے کا کام بھی کرتا ہے۔ اس سے پٹرول کی آتش گیر صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ دھواں بھی کم ہوتا ہے۔ ایک اہم گنا پیدا کرنے والا ملک ہونے کے سبب ہمارے یہاں پٹرول میں ایتھنال ملانے کے بہتر امکانات موجود ہیں۔ 2001 میں حکومتِ ہند نے پٹرول میں 5 فیصد ایتھنال ملانے اور بیچنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن اسے ابھی تک بڑے پیمانے پر نافذ نہیں کیا جاسکا ہے۔ پٹرول میں 10 فیصد ایتھنال ملانے کی تیاری بھی چل رہی ہے۔ پٹرولیم کے بحران کو دیکھتے ہوئے یہ کام جتنی جلدی کرلیا جائے، بہتر ہوگا۔

ایتھنال کی طرح میتھنال بھی ایک الکحل ہے جسے 12 فیصد کی شرح سے پٹرول میں ملایا جاسکتا ہے۔ انڈین پٹرولیم انسٹی ٹیوٹ نے 24 دو پہیہ گاڑیوں کو میتھنال ملے ہوئے پٹرول سے چلا کر جانچنے اور پرکھنے کے بعد اسے کامیاب پایا ہے۔ بڑودا میں اس کو تجرباتی طور پر فروخت بھی کیا جاچکا ہے۔ وہاں کار، دو پہیہ گاڑیوں اور تین پہیہ اسکوٹروں میں اسے کامیاب پایا گیا۔ پھر بھی اسے فی الحال بازار میں لانے کی تیاری نظر نہیں آتی۔ پٹرول کی طرح ڈیزل میں بھی ایک حد تک الکحل ڈیزوہال نام کا ایندھن بنایا گیا ہے۔ برازیل، سویڈن، جرمنی اور آسٹریلیا وغیرہ ممالک میں ڈیزوہال سے موٹر گاڑیاں وغیرہ چلا کر بڑے پیمانے پر اس کے تجربے کیے جارہے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی انڈین پٹرولیم کے ذریعے میتھنال ملا ہوا ڈیزل (15 سے 20 فیصد تک) پر بسیں چلا کر تجربہ کیا گیا۔ ایندھن کی بہتر مہارت اور دھوئیں میں 25 سے 40 فیصد کمی نے ڈیزوہال کو ایک عملی ایندھن کے طور پر تسلیم کرایا ہے لیکن کاروباری طور پر اس کے استعمال اور پیداوار میں فی الحال ابھی کچھ اور وقت لگے گا۔ بیٹری کی بجلی سے موٹر گاڑیاں چلانا ایک پرانا خواب ہے۔ آلودگی سے پوری طرح آزاد یہ گاڑیاں دنیا بھر کی پہلی پسند ہیں، لیکن جب انھیں بڑے پیمانے پر اپنانے کی بات آتی ہے تو اکثر معاملہ ٹائیں ٹائیں پھس ہوجاتا ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ بیٹری والی گاڑیاں زیادہ رفتار سے نہیں چل پاتیں۔ دوسرے بیٹری طویل مدت تک ساتھ نہیں نبھاتی، کیوں کہ اسے بار بار چارج کرنے کا مسئلہ ہے۔ ان پریشانیوں سے نمٹنے کے لیے نئی قسم کی بیٹریاں بنانے پر دنیا کی اہم تجربہ گاہوں میں کام چل رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بیٹری سے چلنے والی چھوٹی بسیں بنائی جاچکی ہیں اور انھیں بھیڑ بھاڑ والے علاقوں میں کمرشیل طور پر چلایا بھی جارہا ہے۔ زیادہ ٹریفک والے علاقوں کے لیے یہ بیٹری بسیں مثالی ہیں کیونکہ یہ آلودگی نہیں پھیلاتیں اور ان سڑکوں پر تیز رفتار کی ضرورت نہیں پڑتی۔ حال ہی میں ملک میں بیٹری سے چلنے والی ''ریوا'' نام کی ایک چھوٹی کار بھی بنائی گئی ہے۔ ایک چھوٹے کنبے کے لیے یہ چھوٹی کار ہر لحاظ سے مناسب ہے۔ اس میں پٹرول کی بہ نسبت کم خرچ ہوتا ہے، اور ایک بار کی چارجنگ پر گاڑی بہت آرام سے 80 کلومیٹر تک چلی جاتی ہے۔ اس کی بیٹری کو گھریلو بجلی کنکشن سے بھی چارج کیا جاسکتا ہے۔ دیکھنے میں بھی یہ کار پرکشش ہے۔ ریوا کار کو فروغ دینے کے لیے غیر روایتی توانائی کے وسائل کی وزارت کی طرف سے خریدار کو سبسڈی بھی دی جاتی ہے۔ ان فوائد کے باوجود کار کا بازار میں مقبول ہونا واقعی باعثِ حیرت ہے۔ شاید کار کو ''اسٹیٹس سمبل'' ماننے والے ہمارے ملک میں ریوا کو اپنی جگہ بنانے کے لیے ابھی مزید انتظار کرنا پڑے گا۔

دوسری طرف عالمی بازار میں پٹرول اور بیٹری دونوں سے ہی چلنے والی ہائی برِڈ الکٹرانک گاڑیاں دکھائی دینے لگی ہیں۔ امریکہ میں ٹویوٹا اور ہونڈا کمپنیاں ایسی گاڑیاں بازاروں میں اتار چکی ہیں، لیکن سڑکوں پر ان کے کم تجربے کو دیکھتے ہوئے ابھی لوگ انھیں بڑے پیمانے پر اپنانے میں ہچکچا رہے ہیں۔ ان کی اونچی قیمت بھی ان کی مقبولیت میں فی الحال رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ ہندستان میں اشوک لی لینڈ کمپنی نے تجرباتی طور پر ہائی برڈ بنائی ہے، اور اسے 2002 کی 'آٹو ایکسپو' میں پیش بھی کیا جاچکا ہے۔ فی الحال ہائی برڈ گاڑیاں بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر جانچ پرکھ اور تجربات کا کام چل رہا ہے۔ کچھ بین الاقوامی تحقیقی اداروں میں شمسی توانائی سے موٹر گاڑیاں چلانے کی کوششیں بھی جاری ہیں، لیکن اس میں کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں مل پائی ہے۔

گاڑیوں میں سی این جی اور ایل پی جی کمرشیل طور پر کامیاب ہوچکی ہیں۔ ہمارے ملک میں ان کو وسیع پیمانے پر استعمال ہونے میں شاید زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ لیکن ایک صاف ایندھن کے طور پر حال میں ڈی ایم ای (ڈائی متھائل ایتھر) نام کی ایک نئی گیس سامنے آئی ہے۔ یہ معمول کے درجۂ حرارت پر گیس کی شکل میں رہتی ہے، اور اسے اونچے دباؤ پر محلول کی شکل میں ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس سے آلودگی بہت کم ہوتی ہے۔ امریکہ اور جاپان میں ڈی ایم ای کا استعمال خاص

طور پر آلودگی کم کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ایک تجربے کے تحت بین الاقوامی شہرت یافتہ والوو بسیں ڈی ایم ای سے کامیابی کے ساتھ چلائی جا چکی ہیں۔ جاپان میں بھی ڈی ایم ای پر تجربہ چل رہا ہے، اور نتائج کافی حوصلہ افزا ہیں۔ ملک میں کئی تیل کمپنیاں ڈی ایم ای کو ایک کثیر الاستعمال ایندھن کے طور پر فروغ دے رہی ہیں۔ ڈی ایم ای کی پیداوار کے لیے گیس کا استعمال کیا جائے گا جسے مشرق وسطیٰ کے ممالک سے منگایا جائے گا۔

حال ہی میں امریکہ کے محکمۂ توانائی نے پی سیریز نامی ایک نئے ایندھن کو متبادل ایندھن کے طور پر منظوری دی ہے۔ امریکہ کے ہی "پیور انرجی کارپوریشن" کے پاس دنیا بھر سے اسے بنانے اور فروخت کرنے کا لائسنس ہے۔ پی سیریز ایندھن دراصل ایتھنال ایم ٹی ایچ ایف نام کے کیمیکل اور کچھ دیگر ہائیڈروکاربن کیمکلو کو ایک طے شدہ تناسب میں ملا کر بنایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایتھنال اور ایم ٹی ایچ ایف کو پیڑ پودوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پٹرول وڈیزل کے مقابلے میں پی سیریز ایندھن کافی کم آلودگی پھیلاتا ہے۔ اسے وسیع پیمانے پر اپنانے کے لیے فی الحال تجربے جاری ہیں۔

ایک طویل عرصے سے ڈیزل میں پانی ملا کر استعمال کرنے کی کوشش چل رہی ہے۔ کہتے ہیں اس سے ڈیزل کی صلاحیت بڑھتی ہے اور آلودگی بھی کم ہوتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ٹنکی میں بھرنے پر تیل اور پانی الگ الگ ہو جاتا ہے۔ جس سے پانی انجن میں گھس کر پرزے خراب کرنے لگتا ہے۔ حال میں 'لیوبریزول کارپوریشن' نام کی کمپنی نے 'پیوری نکس' کے نام سے ڈیزل اور پانی کا موثر حل تلاش کیا ہے اور اسے پیٹنٹ بھی کرا لیا ہے۔ اسی طرح فرانس کی ایک کمپنی نے 'اکوازول' کے نام سے ڈیزل اور پانی ملا کر ایندھن تیار کیا ہے۔ ابتدائی تجربات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈیزل میں 20 فیصد تک پانی ملایا جا سکتا ہے۔ لیکن طویل عرصے تک استعمال کرنے سے انجن پر کیا اثر پڑے گا، فی الحال یہ کہنا مشکل ہے۔

گذشتہ کچھ عرصے میں پٹرولیم مصنوعات کے موثر متبادل کے طور پر کئی ایندھن سامنے آئے ہیں۔ کچھ نے بہتر امکانات بھی پیدا کیے ہیں۔ مستقبل قریب میں پٹرول کی جگہ وہی ایندھن لے سکتا ہے جو کفایتی ہو، محفوظ ہو اور جسے استعمال کرنے میں کوئی دقت نہ ہو اور جس کے استعمال سے آلودگی بھی کم ہو۔ جس دن یہ ایندھن تیار ہو جائے گا پٹرول کو الوداع کہنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

(بشکریہ "سہارا" نئی دہلی، 27 نومبر 2004)

L-368/A, Near Santosh Medical College,
Pratap Vihar, Ghaziabad, (U.P.)

□□□

جراثیم

مصنف: سی وی براشن/مترجم: شریف احمد خاں

جراثیم کرۂ ارض پر پائے جانے والے مختلف النوع جانداروں میں بے حد اہم ہیں۔ یہ مفید بھی ہیں اور مضر بھی۔ زندگی اور موت، صحت اور مرض ہر حالت میں جراثیم ہماری زندگی کا اہم جزو ہیں۔ زیر نظر کتاب میں جراثیم سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

صفحات: 129، قیمت -/36 روپے

چٹانیں بولتی ہیں

مصنف: وشنو متر/مترجم: انوار رضوی

چٹانیں ہماری کائنات کا اہم حصہ ہیں۔ اس کتاب میں زمین کی ابتدا اور ارتقا کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بعض ایسے حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کا انکشاف چٹانوں کے ذریعے ہوا ہے۔ طالب علموں کی آسانی کے لیے متعدد خاکے اور تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔

صفحات: 65، قیمت: -/21 روپے

تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)

مصنف: میر نجابت علی/مترجم: مہ جبیں اختر

نقل و حمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیر نظر کتاب میں ذرائع نقل و حمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپے

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس. کوبداس/مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دارومدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/24 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

محمد خلیل

سمندری لہروں سے توانائی کی فراہمی

موجودہ توانائی کے بحران کو دیکھتے ہوئے یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ اس کے مختلف متبادل ذرائع کی دریافت کی جائے کیونکہ موجودہ ذرائع بھی وقت کے ساتھ ختم ہوجائیں گے۔ اس مسئلے کے مدِ نظر ملک توانائی کی پیداوار کے معاملے میں اب ایک نئے دور میں داخل ہوگیا ہے۔ اب توانائی کے ایک متبادل کی شکل میں سمندر کی لہروں سے منظم طور پر فائدہ حاصل کیا جاسکے گا جس سے توانائی کے بحران کو بڑی حد تک کم کرنے میں مدد ملے گی۔ سمندری لہروں سے بجلی پیدا کرنے کا ملکی پلانٹ گجرات کے خلیج 'کچھ' میں اس سلسلے کی ایک اہم شروعات ہے جو عرصے سے اس میدان میں کام کر رہا ہے۔ ہمیں اپنی کوششوں سے اس توانائی کی فراہمی میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے تاکہ مستقبل میں ہم اپنی اس کامیاب تکنیک کو بیرونی ممالک میں بھی فراہم کرسکیں۔ خاص طور پر صوبۂ گجرات سمندری توانائی کے میدان میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ یہ سمندری ساحلی علاقوں سے قریب ہے۔ اس طرح یہاں اس پر بہ آسانی تجربات کیے جاسکتے ہیں۔ مرکزی حکومت نے گجرات حکومت اور گجرات بجلی بورڈ کی کوششوں کو نظر میں رکھتے ہوئے ابتدائی طور پر تین کروڑ کی لاگت سے خلیج 'کچھ' میں سمندری لہروں کا استعمال کرکے پتا ہے جس میں دو صوبۂ گجرات میں اور ایک مغربی بنگال میں قائم کیے جاچکے ہیں۔ سمندری لہروں سے بجلی پیدا کرنے کا کام ابھی صرف فرانس میں کیا جارہا ہے۔ سمندری لہروں کے لیے ہندستان میں تین ساحلی علاقوں کو چنا گیا ہے۔ جہاں اس کا استعمال کیا جائے گا اور اس کو پھیلانے کے لیے زیادہ امکانات نظر آتے ہیں۔

لہروں سے بجلی کی پیداوار پر ابتدائی تحقیقات کا آغاز 1966 میں ہوا تھا اور اس کے بعد اقوام متحدہ کے ماہرین کے تعاون سے 1975 میں اس کی ایک رپورٹ تیار کی گئی تھی۔ موجودہ کامیابی انھی کوششوں کا حاصل ہے۔

ایک اندازے کے مطابق زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور زمین پر تقریباً 70.5 فیصد حصے کو ڈھکے ہوئے ہے۔ ہمارے لیے توانائی پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے کیونکہ ہمارے ملک کا بحری ساحل ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے اور اس طرح سمندری لہروں سے توانائی فراہم کرنے کا ہمارے سامنے ایک بڑا ذریعہ ہے۔

خلیج کچھ کی یہ سمندری لہریں چھ سے آٹھ میٹر تک اونچی ہوتی ہیں اور انھیں مشینی تکنیک سے بجلی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ گجرات کے لیے خاص طور پر یہ منصوبہ نہایت کارآمد ہے کیونکہ یہ صوبہ کوئلے کے علاقوں سے کافی دوری پر ہے۔ یوں سمجھیے کہ کوئلے کا سب سے نزدیکی علاقہ گجرات سے تقریباً ایک ہزار میل کی دوری پر واقع ہے۔ اس طرح بجلی پیدا کرنے کا یہ ذریعہ ان وجوہات کی بنا پر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حکومت نے گذشتہ برسوں میں توانائی کے بحران کو حل کرنے کے لیے توانائی کے متبادل ذرائع کا ایک کمیشن ''کاسا'' قائم کیا تھا۔ اس کے قائم کیے جانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس میدان میں رونما ہونے والی سرگرمیوں کا جائزہ لے گا اور ساتھ ہی اس کو بہتر بنانے کے لیے مزید تحقیق کی سرگرمیوں کو تیز کرنے میں مدد دے گا۔

ہمارے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اس منصوبے سے بجلی پیدا کرنے میں اقتصادی طور پر بڑی مدد ملے گی لیکن مستقبل میں ہمیں اس پروجیکٹ پر ایک اندازے کے مطابق تقریباً پانچ سو کروڑ روپے اسے بڑے پیمانے پر چلانے کے لیے خرچ کرنے ہوں گے اور اس سے فراہم کی ہوئی بجلی پر پندرہ پیسے سے زائد فی کلو واٹ گھنٹہ صرف ہوگا جبکہ اس کے مقابلے میں حرارتی بجلی پر اٹھارہ پیسے فی کلو واٹ گھنٹہ خرچ آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے پورے طور پر فائدہ اٹھانے میں ابھی وقت درکار ہے کیونکہ ابھی یہ تکنیک تجربات سے گزر رہی ہے اور اس کے بعد ہمیں اس سے نتیجہ نکالنا ہوگا اور موسمیاتی اور دوسرے اثرات کا جن کا اس کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور سمندری لہروں پر اثر انداز ہوسکتی ہیں ان کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔ خاص طور پر کچھ تجرباتی منصوبے سے یہ بات بھی سامنے آجائے گی کہ اس قسم کے بجلی گھر صوبۂ گجرات کے مختلف حصوں میں لگائے جاسکتے ہیں یا نہیں اور ان سے مقابلتاً کہاں تک زیادہ فائدہ حاصل ہوسکے گا۔

ملکی سائنسداں اور تکنیکی ماہرین بھی اس نئی تکنیک سے پُر اُمید ہیں اور ان کا خیال ہے کہ انھیں اس پروجیکٹ میں کامیابی حاصل ہوگی اور خلیج کچھ پروجیکٹ سے توانائی کے متبادل ذرائع کو حاصل کرنے میں مدد ملے گی اور اُس وقت ہمارے پاس ایک نئی سائنسی تکنیک ہوگی۔ اس سے جو اُمیدیں وابستہ ہیں انھیں دیکھتے ہوئے اگر ہم یہ کہیں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اس پروجیکٹ کی کامیابی سے ملک میں ایک نئے دور کی ابتدا ہوگی۔

H51, Dr. Iqbal Lane, Muradi Road, Batla House,
Jamia Nagar, New Delhi-110025

□□□

تحریر: پربھات رنجن
ترجمہ: مشرف علی

خوفناک سمندری لہریں

سمندر اب خاموش ہے۔ 26 دسمبر 2004 کو جان و مال کی بربادی کا پیغام لے کر آئی سونامی (Tsunami) لہریں اب کسی کا پیچھا نہیں کر رہی ہیں۔ سنامی لہریں ہزاروں زندگیوں کو موت کی آغوش میں پہنچا کر سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو گئی ہیں۔ خطرناک سونامی لہروں نے تباہی و بربادی کا وہ منظر پیش کیا ہے جس کی عصرِ حاضر میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ 26 دسمبر کی صبح جو لوگ سنامی لہروں پر سوار موت کے جال میں نہیں پھنس سکے وہ اب خوف، افواہ اور وسائل کی کمی کے جال میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ زلزلے کی وجہ سے زمین کے محور کے کانپ اٹھنے، نقشے سے کچھ جزیروں کے غائب ہونے اور کچھ کے کھسک جانے سے پوری دنیا کے حصص بازاروں پر چاہے کوئی خاص فرق نہ پڑا ہو لیکن انڈمان سے لے کر کیرالا تک کے ساحلوں پر بسے ماہی گیروں، دور دراز سے آئے سیاحوں اور سمندری ساحلوں پر سیر کی غرض سے نکلے ان لوگوں پر خوب پڑا جن کی زندگی کو خوفناک سونامی لہروں نے لقمۂ اجل بنا دیا۔

ساحل پر بسے تمل ناڈو کے تین شہر کوڈلور، ناگ پٹی نم اور ویلانگنی تقریباً برباد ہو چکے ہیں۔ 60 سے زیادہ گاؤں کا کوئی نام و نشان نہیں بچا ہے۔ یہاں کے تیرہ اضلاع کے 500 گاؤں سونامی سانحے سے بری طرح متاثر ہوئے۔ کیرالا کے اضلاع الپوتھا اور کولم میں سنامی کی لہروں نے قہر برپا کیا تو دوسری طرف آندھرا پردیش کے اضلاع کاکی ناڑا اور نیلو کے 300 گاؤں کو تباہ و برباد کر دیا۔ پانڈیچیری کے قریب سو کلومیٹر لمبے ساحل پر جہاں سونامی لہروں نے خوفناک طوفان کا منظر پیش کیا تو وہیں انڈمان۔نکوبار میں ہوئی تباہی و بربادی کا صحیح اندازہ اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ تقریباً آٹھ جزیروں کے سمندر میں ڈوب جانے اور کئی جزیروں کے سنسان ہو جانے کا خطرہ لاحق ہے۔ دنیا میں اب تک کی سب سے بڑی امدادی کارروائی شروع ہو چکی ہے تاہم ابھی بھی نکوبار کے کئی جزیرے اور پانڈیچیری، تمل ناڈو، کیرالا اور آندھرا پردیش کے کئی گاؤں امدادی کارکنوں کی پہنچ سے دور ہیں۔ چند لمحوں میں ہی اپنا گھر، گاؤں، پڑوسی، بیوی اور دو بچوں کو گنوا چکے پانڈیچیری کے پی۔ پنیر سیلوم کے پاس بیوی اور بچوں کی ایک تصویر بچی ہے جسے دیکھتے اور روتے ہوئے اس نے دو دن گزار دیے، اور دو دن کے بعد ٹوٹی کشتی (ناؤ)، پھٹے جال اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے دو وقت کی روٹی کی فکر لاحق ہوئی۔ اپنے نقصان کا اندازہ لگانا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ یہ صورتِ حال محض پانڈیچیری کے پی۔ پنیر سیلوم کی ہی نہیں بلکہ ان نو لاکھ لوگوں کی ہے جو اپنا بہت کچھ گنوا کر آلودہ پانی اور خراب کھانے کے سہارے امدادی خیموں یا پھر کھلے آسمان کے نیچے رہنے پر مجبور ہیں۔ سونامی سانحے سے متاثر ناگاپٹی نم کے لوگ ہوں یا کاکی ناڑا کے، یہ تمام افراد بیماری اور وبائی امراض کے خوف سے سہمے ہوئے ہیں۔ راحت، امداد اور از سر نو بحالی کے بڑے بڑے اعلانات کو نظر انداز کر کے، لاکھوں متاثر زدہ افراد ان رضا کارانہ تنظیموں کے رضا کاروں کی بات سن رہے ہیں جو دن رات ان کی مدد کر رہے ہیں۔ ریت اور ملبوں میں دبی اور سڑ چکی لاشوں کو تلاش کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ لاپتہ لوگوں کی فہرست میں لگاتار رد و بدل ہو رہا ہے۔ آنکھوں سے اوجھل ہو چکے جزیروں کی تلاش کا کام شروع ہے، لیکن کوئی تصویر، کچھ کپڑے، کچھ برتن، بکھرے خواب اور برباد ہو چکے گھر کا ملبہ سمیٹے نو لاکھ سے زیادہ لوگوں کو دلاسہ دینے کا کام اب تک شروع نہیں ہو پایا ہے۔ سنامی نے سب سے زیادہ ان ماہی گیروں کو تباہ کیا جو سب سے زیادہ سمندر کے رموز سے واقف ہیں تاہم وہ سونامی اور اس کے بعد پیدا شدہ حالات سے نبرد آزما ہونے سے واقف نہیں۔

کوڈ اور سمندر دیوتا اگر خوش ہو جائیں تو گھر موتیوں سے بھر جاتا ہے۔ صبح سویرے اپنے گھروں سے نکلے لوگ اسی آرزو کے ساتھ ساگر دیوتا کے لیے ہتھیلی میں تازہ پھول لے کر نکلے تھے لیکن سمندر دیوتا کے من میں کھوٹ تھا۔ وہ موتیوں سے بھری لہروں پر نہیں بلکہ اس لہر پر سوار ہو کر آئے جو موت کا پیغام تھی۔ نکوبار پر سونامی کی پہلی دستک کے ساتھ ایئر فورس ہیڈ کوارٹر میں خبر پہنچ گئی۔ اپنے گھر والوں، گاؤں والوں، دوستوں اور پڑوسیوں کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے بدحواس لوگوں کے پاؤں تھک کر چور ہو گئے۔ ساتھ ہی سونامی کے لوٹ آنے کی افواہیں بھی شروع ہو گئیں۔ 30 دسمبر کی صبح شعبۂ موسمیات کی وارننگ نے کیرالا کے ساحلوں پر افرا تفری کا عالم پیدا کر دیا۔ فوری طور پر وزارتِ داخلہ نے بھی متاثرہ ریاستوں میں لوگوں کو سمندری ساحلوں سے ہٹانے کا حکم جاری کر دیا۔ انڈمان کے نائب گورنر پروفیسر رام کاپسے نے لوگوں کو دن کے 12 بجے سے پہلے محفوظ مقامات پر چلے جانے کا فرمان جاری کیا۔ ہر طرف یہ خدشہ تھا کہ سونامی لہریں کبھی بھی آ سکتی ہیں۔ تمل ناڈو، آندھرا پردیش، پانڈیچیری ہر جگہ لوگ بدحواسی کے عالم میں بھاگتے نظر آئے۔ بعد ازاں وزیر برائے سائنس اور ٹیکنالوجی کپل سبل نے ان شکوک و شبہات کی تردید کی۔

آندھراپردیش میں ہوئے نقصانات کی تلافی کے لیے مرکزی حکومت سے صوبائی حکومت سے 122 کروڑ روپیے کی مالی امداد طلب کی ہے۔ ماہی گیروں کے لیے 40ہزار مکانوں اور ڈیڑھ لاکھ ٹن چاول کی مزید مانگ بھی مرکزی حکومت سے کی جائے گی۔صوبہ آندھراپردیش کے وزیراعلا وائی چندر شیکھر ریڈی متاثرہ علاقوں کے جائزے کے بعد راحت ایجنسیوں کو چاق و چوبند بنانے میں لگے ہیں تاکہ مصیبت زدہ افراد کو فوری طور پر امداد مہیا کرائی جاسکے۔ کیرالا، آندھراپردیش، تمل ناڈو، پانڈیچیری اور انڈمان نکوبار میں سنامی لہروں نے سیاحت اور مچھلی کے کاروبار کی کمر توڑ دی ہے۔بعض تو واپس سمندر میں جانا ہی نہیں چاہتے اور جو جانا چاہتے ہیں ان کے پاس نہ تو ناؤ ہے اور نہ ہی جال۔چینئی کے ماہی گیروں کی تنظیمیں اپنے ماہی گیروں کے نقصان کا تخمینہ لگا رہی ہیں۔ ساحلوں پر سوکھ رہی مچھلیوں کا ڈھیر اب سڑ چکا ہے۔ لاشوں کو ڈھونڈنے اور انھیں ٹھکانے لگانے میں مشغول رضا کاروں کے لیے انھیں ہٹا پانا کسی چیلنج سے کم نہیں ہے۔ وبائی امراض نہ پھیلے، اس کے لیے آندھراپردیش اور کیرالا کی حکومتیں تمل ناڈو کے مقابلے میں زیادہ فعال ہیں۔تمل ناڈو میں ان دونوں صوبوں کے مقابلے سونامی کی لہروں نے زیادہ تباہی مچائی۔معیشت کی نبض پر ہاتھ رکھنے والے ماہرین کا اندازہ ہے کہ تمل ناڈو کی 15فیصد تجارت اور روزگار ٹھپ پڑ گیا ہے۔تقریباً بیس ہزار کروڑ روپیوں کا نقصان ہوا ہے۔لیکن اعداد وشمار جنوبی ہندستان میں ہوئی تباہی و بربادی کی حقیقت آشکارا نہیں کرتے۔ جیسے تیسے جان و مال کے نقصان کا اندازہ لگایا جارہا ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں سے غیر حکومتی تنظیموں کے نمائندے چینئی پہنچ گئے ہیں اور ہندستانی مددگار تنظیموں کی مدد سے امدادی کاموں میں مشغول ہوگئے ہیں۔ فی الوقت ان ایجنسیوں کا دھیان وبائی امراض کو پھیلنے سے روکنے اور طوفان سے متاثر افراد کو خوردونوش کے ساتھ عارضی رہائش گاہ مہیا کرانے پر ہے۔

لیکن بڑے پیمانے پر امدادرسانی کے باوجود صوبے میں فی الحال صورت حال پوری طرح قابو میں نہیں ہے۔ مرینا ساحل کو فی الحال بند کروادیا گیا ہے۔چینئی کے متاثرہ افراد کے لیے صاف پانی اور کھانے کی قلت ہے۔ ماہی گیروں کو جو نقصانات ہوئے ہیں، ان کی تلافی کے لیے اقدامات کیے جارہے ہیں۔

راحت اور بحالی میں لگی ایجنسیوں کی سب سے بڑی فکر انڈمان نکوبار جزیرہ ہے۔ برطانوی دور میں ''کالا پانی'' کے نام سے مشہور زمین کا یہ حصہ سونامی لہروں کے ذریعے ہونے والی بربادی کا سب سے بڑا شکار ہے۔ حالانکہ سرکاری طور پر اس کی تصدیق نہیں ہوئی ہے تاہم غیر سرکاری اندازے کے مطابق نکوبار اور آس پاس کے جزیروں کے دس ہزار لوگ لاپتہ ہیں۔ چرچ کے ذرائع کے مطابق طوفان کے بعد امدادی اور بچاؤ کے کاموں کو لے کر غیر آدی واسی ناخوش ہیں۔ ابھی تک اطلاعاتی نظام پوری طرح ٹھیک نہیں ہونے سے انڈمان نکوبار میں ہوئے نقصانات کا اندازہ لگانا مشکل ہے، لیکن جانکاری کے مطابق ٹریجا کرچل، چورا، کموترا بشمول کارنکورنار جزیرے کی بیس ہزار آبادی میں سے نصف لوگ لاپتہ ہیں۔ کیلے کن اور کیمپ بیل کے چاروں طرف رہنے والے سومپین آدی واسی بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ انڈمان میں رہنے والی جاروا، اونگ اور سینٹی نلی آدی واسی محفوظ ہیں۔ پورٹ بلیر میں پینے کے پانی کی زبردست قلت ہے۔ یہاں روزانہ 40لاکھ لیٹر پانی کی ضرورت ہے لیکن فی الحال 20لاکھ لیٹر ہی پانی مہیا ہو پارہا ہے۔

سونامی لہروں نے فوج کو بھی کافی نقصان پہنچایا، اس کے باوجود ہندستانی فوج سونامی سانحے کے شکار لوگوں تک امداد پہنچانے اور انھیں محفوظ مقامات پر منتقل کرنے میں دل و جان سے لگی ہوئی ہے، ہماری فوج یہ کام نہ صرف ہندستان میں بلکہ سری لنکا اور مالدیپ میں بھی کررہی ہے۔

ISRO کے ذریعے ہنگامی انتظامیہ کمیٹی کو سٹیلائٹ سے لی گئی تصویریں لگاتار مہیا کرائی جارہی ہیں تاکہ امدادرسانی کے کام بہتر طریقے سے انجام دیے جاسکیں۔ بحری فوج کے لگ بھگ تمام جنگی جہاز امدادی کاموں میں مشغول ہیں۔ٹوہی (جاسوسی) طیارہ، ٹیپو۔ 142، فوج کے کارگو (باربردار) طیارے اور ہیلی کاپٹر اس کام میں مشغول ہیں۔ دو سو فوجی جوانوں کے ساتھ آئی.این.ایس. گھڑیال کارنکوبار پر امدادی کام میں لگا ہوا ہے تو مرچنٹ نیوی کا این دی، پوراو پورٹ بلیئر پر تعینات ہے۔ آئی این ایس کمبھیر نان کووری جزیرے پر امدادی کاموں میں لگا ہوا ہے، تو آئی.این.ایس. راجپوت، آئی. این. ایس. چیتا اور آئی. این. ایس 'مگر' بھی ضروری اشیا کی فراہمی اور راحت کے کام میں مشغول ہے۔ لیکن ان تمام تیاریوں کے باوجود نکوبار جزیرے میں ہوئے جان و مال کے نقصانات کی اب تک پوری جانکاری حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ ہندستانی فوج (بری، بحری اور فضائیہ) کی جانب سے چلائے جارہے ریلیف ورک کو، آپریشن مدد، سری لنکا میں چلائے جارہے ریلیف ورک کو، آپریشن رین بو، اور مالدیپ میں چل رہے ریلیف ورک کو آپریشن کیسٹر کا نام دیا گیا ہے۔ یہ بات قابل ستائش ہے کہ ہمارے فوجی افسران بھی بہ نفس نفیس جنگی پیمانے پر اس کار خیر میں حصہ لے رہے ہیں۔

(بشکریہ ''سہارا سے''، نئی دہلی، 8/جنوری 2004)

مترجم کا پتا:
**# 356, Jhelum Hostel, JNU,
New Delhi-110067**

□□□

بھرت جھن جھن والا

ہندستان اقتصادی سوپر پاور بنے گا

ملک میں بنیادی سہولیات جیسے بجلی اور سڑک کی کمی ہے، تعلیم اور صحت میں ہم پیچھے ہیں۔ سرکار عوام کو بنیادی سہولتیں مہیا نہیں کرا پا رہی ہے، جیسے بے روزگاری بھتہ اور صاف پینے کا پانی اس صورت حال میں سپر پاور بننے کی بات بے تکی لگتی ہے۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے۔

اقتصادی سپر پاور بننے کے لیے پہلی ضرورت تیز اقتصادی ترقی کی ہے۔ ہندستان، امریکہ اور جرمنی کے موازنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ ہماری اقتصادی ترقی کی شرح اونچی ہے۔ عالمی بینک کے ذریعے شائع کیے گئے عالمی ترقیاتی اشاریے کے مطابق گذشتہ دو دہائیوں میں ہندستان کی اوسط شرح ترقی 5.7، امریکہ کی 3.4 اور جرمنی کی 1.9 فیصد سالانہ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہم تیزی سے ترقی کررہے ہیں۔ لیکن ہماری آبادی بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے جو کہ اونچی اقتصادی ترقی کی شرح کو کچھ کم کردیتی ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں ہماری آبادی میں اضافے کی شرح 1.9، امریکہ کی 1.1 اور جرمنی کی 0.2 فیصد سالانہ رہی ہے۔ اس سے ہماری حقیقی چال کچھ دھیمی پڑتی ہے پھر بھی ہم آگے ہی رہتے ہیں۔ آبادی کے اثرات منہا کرنے کے بعد ہماری اقتصادی ترقی کی شرح 3.8، امریکہ کی 2.3 اور جرمنی کی 1.7 فیصد سالانہ رہتی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ ان دو دہائیوں میں ہماری اقتصادی ترقی کی شرح میں اضافہ ہوا ہے جبکہ امریکہ اور جرمنی میں کمی آئی ہے۔ عالمی بینک کے اعداد وشمار کے مطابق 80 کی دہائی میں ہماری اقتصادی ترقی کی شرح 5.7 فیصد تھی۔ جو 90 میں 5.8 فیصد ہوگئی۔ حالیہ دنوں میں یہ 6 فیصد سے اوپر چل رہی ہے۔ امیر ممالک کی حالت بالکل برعکس ہے۔ ان دو دہائیوں کے درمیان امریکہ کی اقتصادی ترقی کی شرح 3.5 فیصد سے گھٹ کر 3.3 فیصد رہ گئی ہے۔ جبکہ جرمنی کی 2.3 فیصد سے گھٹ کر 1.6 فیصد۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تیزی سے چلنے کے ساتھ ساتھ ہماری چال میں مزید تیزی آتی جارہی ہے جبکہ امیر ممالک کی چال دھیمی پڑ رہی ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ہم یقیناً ہی اقتصادی سوپر پاور بن سکتے ہیں۔

رہا سوال بنیادی سہولیات کا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بے روزگاری بھتہ، تعلیم اور موت کی شرح جیسے اشاریوں میں ہم امیر ممالک سے بہت پیچھے ہیں لیکن ہمارے اور امیر ممالک کے ترقیاتی امور میں بنیادی فرق ہے۔ ہندستانی تہذیب کا مرکز سماج ہے۔ ہم نے سرکار کو کبھی سب سے اونچے عہدے پر نہیں بٹھایا ہے۔ اس کے برعکس امیر ممالک کی تہذیب سرکار پر مرتکز ہے۔ جو کام ہم اجتماعی سطح پر کرلیتے ہیں وہ امیر ممالک میں سرکار کے توسط سے انجام پاتا ہے۔ مثال کے طور پر صحت سے متعلق سہولتیں مہیا کرانے میں ہمارا پرائیویٹ سیکٹر زیادہ بااثر ہے۔ اقوامِ متحدہ ترقیاتی پروگرام کی جانب سے شائع کردہ انسانی ترقیاتی رپورٹ 2004 کے مطابق ہندستان میں صحت پر ملک کی آمدنی کا محض 4.9 فیصد خرچ کیا جاتا ہے۔ اس میں محض 11 فیصد سرکار کے ذریعے خرچ کیا جاتا ہے۔ امریکہ اور جرمنی میں صحت پر کل خرچ ملک کی آمدنی کا بالترتیب 13.9 اور 10.8 فیصد ہے جو کہ ہمارے خرچ سے دوگنے سے بھی زیادہ ہے۔ مگر امیر ممالک میں سرکار کا حصہ زیادہ ہے۔ امریکہ میں صحت پر کل خرچ کا 45 فیصد اور جرمنی میں 75 فیصد سرکار کے ذریعے خرچ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا سرکار کے ذریعے فراہم کی گئی صحت سے متعلق سہولیات کے موازنے کی بنیاد پر ان ممالک کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہندستان میں صحت پر کیے گئے ذاتی خرچ کم ہوتے ہوئے بھی زیادہ اثردار ہوسکتے ہیں۔ چونکہ ذاتی اخراجات کا استعمال بہتر ڈھنگ سے ہوتا ہے۔ یہاں آدمی کو اپنا علاج کرانا ہو تو اس ڈاکٹر سے دوا لیتا ہے جس سے پڑوسی کو آرام ملا ہو۔ سرکاری نظام میں علاج اس سے کرایا جاتا ہے کہ جسے سرکار بحال کرتی ہے چاہے وہ ناکام ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ سرکار کے توسط سے خرچ بڑھ جاتا ہے۔ پہلے سرکار شہریوں پر ٹیکس لگاتی ہے۔ ٹیکس وصولی میں خرچ آتا ہے۔ بدعنوانی بھی بڑھتی ہے۔ پھر وہ محصول کئی وزارتوں، محکموں اور دفتروں سے ہوتے ہوئے سرکاری ڈاکٹروں کے پاس پہنچتا ہے۔ وہ ڈاکٹر شہریوں کا ''مفت'' علاج کرتا ہے۔ دونوں نظام میں پیسہ بہرحال شہریوں کا ہی خرچ ہوتا ہے۔ ہمارے نظام میں شہری ڈاکٹر کے پاس براہِ راست جاکر اپنا علاج کراتے ہیں۔ امریکی نظام میں شہریوں پر زیادہ ٹیکس لگا کر اس پیسے سے انھیں مفت علاج کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ نظام کے اس فرق کے سبب ہماری صحت، تعلیم، بے روزگاری بھتہ وغیرہ مدوں پر سرکاری خرچ کم نظر آتا ہے جبکہ حقیقت میں ہمارے کل خرچ ہلکے ہونے پر بھی زیادہ کارآمد ہیں۔

ہمارے اقتصادی نظام میں سرکار کے رول کا فرق ہے۔ عالمی بینک کے اعداد وشمار کے مطابق ہندستانی سرکار کی محصولات ملک کی آمدنی کا 13.0 فیصد

تھی۔ اس کے سامنے امریکہ میں سرکاری محصولات ملک کی آمدنی کا 18.9 فیصد تھی اور جرمنی میں 25.9 فیصد تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم ہلکی سرکار پسند کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں سرکار کا رول کم ہے اس لیے سرکار کے توسط سے ملنے والی تعلیم اور دیگر سہولیات کا موازنہ مناسب نہیں۔ جس طرح ہوٹل میں کھانا کھانے والوں کی تعداد کم ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا ہے کہ لوگ زیادہ تعداد میں بھوکے ہیں۔ امیر ممالک میں بھی روزگار کی حالت اچھی نہیں ہے۔ عالمی بینک کے مطابق 1999-2001 میں پرائمری سطح کے تعلیم یافتگان میں ہندستان میں 29.6 فیصد بے روزگار تھے۔ امریکہ میں 26.8 فیصد اور جرمنی میں 20.3 فیصد۔ پرائمری تعلیم یافتگان میں ہندستان میں بے روزگاری سب سے زیادہ تھی۔ انٹرمیڈیٹ سطح کے تعلیم یافتگان میں بے روزگاری کی سطح بالترتیب 40.3 فیصد، 60.4 فیصد اور 35.3 فیصد تھی، امریکہ اوپر تھا۔ اعلا تعلیم یافتگان میں بے روزگاری کی شرح بالترتیب 30.7 فیصد، 12.8 فیصد اور 44.4 فیصد تھی، جرمنی اوپر تھا۔ پرائمری تعلیم یافتگان میں ہندستان میں بے روزگاری زیادہ تھی۔ انٹرمیڈیٹ تعلیم یافتگان میں امریکہ اور اعلا تعلیم یافتگان میں جرمنی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بھاری خرچ کے باوجود امیر ممالک اپنے شہریوں کو روزگار فراہم کرانے میں ناکام رہے ہیں۔ جبکہ ہندستان میں بے روزگار آدمی کو اس کے چچا، ماموں اور دیگر رشتے دار کام پر لگا لیتے ہیں۔ جو کہ بے روزگاری بھتے کا کام کرتا ہے۔ امریکہ میں یہی کام سرکار کے توسط سے ٹیکس لگا کر ہوتا ہے جو نتیجتاً ناکام ہوتا ہے۔

امریکہ اور جرمنی کے موازنے میں ہندستان کی اقتصادی ترقی کی شرح اونچی ہے اس لیے ہم ان ممالک کو پکڑ لیں گے۔ ان ممالک میں سرکار کا رول زبردست ہے جو کہ کھٹکتا ہے مگر سرکار کے موجودہ بھاری رول سے ان ممالک کے مستقبل کا اندازہ لگانا اس طرح ہے جیسے شراب کی کھپت سے کسی آدمی کے مستقبل کا۔ آنے والے وقت میں امیر ممالک بحران کا شکار ہوسکتے ہیں اور ان کا یہ بھاری بھرکم سرکاری خرچ دباؤ میں آسکتا ہے۔ امریکہ میں اس وقت بھاری تجارتی گھاٹا چل رہا ہے جسے بیلینس کرنے کے لیے ڈالر کی قیمتوں میں زوال ضروری ہے۔ لہٰذا تعلیم اور صحت جیسے اہم مدوں میں سرکاری خرچ کی خستہ حالی کے باوجود ہندستان کا اقتصادی سپر پاور بننا ناممکن نہیں۔

732, Modern Society Sector 15, Rohini,
Post Box 10754,
Delhi-110 085

□□□

گاندھی کی کہانی

مصنف: راجکماری شنکر/مترجم: نامی انصاری

اس کتاب میں بابائے قوم کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ
ہندستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ بھی عام فہم زبان میں درج کی گئی ہے۔
گاندھی جی اور ان سے متعلق دیگر افراد کی تصویریں بھی کتاب میں موجود ہیں۔

صفحات:120، قیمت-/35روپے

بچوں کے نہرو

ایم. چالاپاتھی راؤ/مترجم: نامی انصاری

پنڈت جواہر لال نہرو بچوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور اس لیے بچے انھیں
چاچا نہرو کہتے تھے۔ اس کتاب میں جدید ہندستان کے اس معمار کی حیات
اور شخصیت کے تمام گوشوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔

صفحات:112، قیمت:-/32روپے

اندرا ایک پریہ درشنی

مصنفہ: اکا شنکر/مترجم: عتیق مظفر پوری

اس کتاب میں تقریباً تین دہائیوں تک ہندستانی سیاست پر
چھائی رہنے والی اندرا گاندھی کی شخصیت اور زندگی
کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات:142، قیمت:45روپے

شنکر

مصنفہ: اکا شنکر/مترجم: انیس اعظمی

ملک کے مایۂ ناز کارٹونسٹ کیشو شنکر پلئی
کی سوانح، جو دلچسپ بھی ہے اور
حوصلہ بخشنے والی بھی۔

صفحات:128، قیمت:-/35روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شہیر عباسی

اشوک اعظم

چندر گپت موریہ کے پوتے اشوک کے عہد میں پہلی کل ہند سلطنت اپنی بلندیوں پر پہنچی۔ کلنگ کی لڑائی نے نہ صرف موریہ سلطنت کی توسیع کی بلکہ وہ اشوک کی جنگ سے دست برداری کی ایک ریاستی پالیسی کی علامت بھی تھی۔

ایچ۔جی۔ ویلس (H.G.Wells) اپنی کتاب ''آؤٹ لائن آف ورلڈ ہسٹری'' میں لکھتا ہے۔'' ایسے ہزاروں اور لاکھوں بادشاہ جن کے ناموں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں، ان کے جاہ وجلال، ان کی مہربانی وعنایات اور ان کے شاہی عظمت و وقار کے درمیان اشوک کا نام تنہا ایک ستارے کی مانند روشن ہے۔'' دولگا سے لے کر جاپان تک آج بھی اس کا نام قابل احترام مانا جاتا ہے۔ چین، تبت اور یہاں تک کہ ہندستان میں بھی، اس کی عظمتوں کی روایت محفوظ ہے۔

اشوک اپنے ابتدائی برسوں میں پُر تشدد طبیعت کا تھا۔ بعض بدھ ادب پاروں میں اسے ''چنڈ اشوک'' کہا گیا ہے۔ اپنے باپ بندوسار کے عہد حکومت میں ہی اسے انتظامی امور کا خاطر خواہ تجربہ ہو چکا تھا جبکہ اسے شمال مغربی علاقوں کا گورنر مقرر کیا گیا تھا جس کی راجدھانی تکشلا تھی اور جو بعد میں اجین منتقل ہوگئی۔ اس نے ایک دولت مند تاجر کی بیٹی سے شادی کی جو شہزادے مہندر کی ماں بنی۔

جیسے ہی اشوک کو اپنے باپ کی بیماری کی اطلاع ملی۔ اس نے مگدھ کی راجدھانی پاٹلی پتر کی طرف کوچ کیا، اسے اپنے قبضے میں کیا اور ایک کو چھوڑ کر سبھی سو شہزادوں کو قتل کر دیا۔ اپنے خلاف ہونے والی بغاوت کا سر کچلنے میں اسے تقریباً چار برس لگے اور اس مدت کے ختم ہوتے ہی اس نے اپنی تاجپوشی کی اور راجہ بن گیا۔

اپنی حکومت کے ابتدائی برسوں میں، اشوک اپنے وقت کے دوسرے حکمرانوں کی طرح ہی تھا، اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہو۔ سلطنت اس کے دادا اور باپ کی بنائی ہوئی تھی جو وسط ایشیا تک اور ہمالیہ سے میسور اور آسام سے لے کر ہندوکش تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ حکومت سوائے چند جنوب مشرقی علاقوں کے پورے ہندستان پر محیط تھی۔

اپنے باپ اور دادا کی فتوحات اور توسیعی کاموں کو جاری رکھنے اور پورے ہندستان کو ایک مرکزی انتظام کے تحت لانے کی غرض سے اشوک نے کلنگ کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔ یعنی وہ علاقے جو آج اڑیسہ اور آندھرا پردیش کا حصہ ہیں۔ وہ اس میں کامیاب رہا لیکن اس کے لیے اسے زبردست نقصانات اٹھانے پڑے۔ اس کے ایک فرمان کے مطابق'' ایک لاکھ پچاس ہزار لوگوں کو قید کیا گیا، ایک لاکھ لوگ ہلاک کر دیے گئے۔ یہاں تک کہ برہمنوں اور بھکشوؤں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ ایسے لوگ جو زخموں یا دوسری جنگی وجوہات سے مر گئے ان کی تعداد کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہے۔

تباہی بے حد خوفناک تھی اور جب قتل عام کی خبر اشوک تک پہنچی وہ بہت ہراساں ہوا اور اپنی اس فتح پر اس نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ'' ایسی فتح کس کام کی جس کے لیے انسانیت کی ایسی قیمت چکانی پڑے؟'' اس نے اپنی ذات کا مشاہدہ کیا اور اپنے اس فعل پر بے حد پشیمان ہوا۔ یہی وہ ذہنی کیفیت تھی جب اس نے مشہور بودھ عالم متھرا کے ''اُپ گپت'' (اس سلسلے میں ایک اور نام تستا ماگلی پتا کا لیا جاتا ہے) کے ہاتھوں بدھ مذہب اختیار کر لیا۔ تب اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ لڑائی اور تشدد سے کنارہ کشی اختیار کرلے گا اور ''دھرم وجے'' یا لوگوں کے ذہنوں اور دلوں کو فتح کرنا شروع کیا۔ اس نے انتظامیہ کو انسان دوست اور ہمدرد بنانے کے لیے اقدام کیے۔ اس نے مہاتما بدھ کی زندگی سے وابستہ سبھی مقامات کا سفر کیا۔ اس نے لمبنی میں جہاں پر مہاتما کی پیدائش ہوئی تھی، گیا، جہاں انھیں گیان حاصل ہوا تھا، سارناتھ، جہاں پر انھوں نے اپنا پہلا پیغام دیا تھا اور کشی نگر جہاں انھوں نے اپنی آخری

● "Turning Points of Indian History" جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب ہے جس میں ہندستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنھوں نے ہندستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ ''اردو دنیا'' میں اس کا ترجمہ "ہندستانی تاریخ کے اہم موڑ" کے نام سے قسط وار شائع کیا جارہا ہے۔

سانسیں لی تھیں، ان کی یاد میں ستون تعمیر کروائے۔

وہ پیغامات جو بدھ نے لوگوں کی اخلاقی بلندی کے لیے تین سوصدی قبل دیے تھے، وہ اشوک کے لیے لوگوں کے ذہنوں اور دلوں کو فتح کرنے کا بنیادی وسیلہ تھے۔ حالانکہ، اشوک کسی مذہبی فرقے کا متعصب پیغامبر نہیں تھا۔ اس کے فرمان جو چٹانوں اور ستونوں پر کندہ کیے جاتے تھے وہ دھم کی روح تھے نہ کہ کوئی رسم یا مذہبی عقیدہ۔ اس نے لوگوں کو آپس میں امن و آشتی کے ساتھ رہنے کی تلقین کی اور اپنے دھرم کی تعریف اور دوسروں کے عقائد کو برا سمجھنے سے منع کیا۔ وہ جو کچھ کہتا تھا اس پر عمل بھی کرتا تھا اور اس کی فیاضی بدھ بھکشوؤں کے ساتھ ساتھ برہمنوں اور جین سادھوؤں کے لیے بھی یکساں تھی۔

اشوک چاہتا تھا کہ وہ اپنی رعایا سے وہی سلوک کرے جو ایک باپ اپنی اولاد سے کرتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ" سارے لوگ میری اولاد ہیں" جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کی خبر گیری کرتا ہے اسی طرح بادشاہ کو اپنی رعایا کی خبر گیری کرنی چاہیے۔ اس کا کہنا تھا کہ" یہاں تک کہ میں نے اپنے گورنروں کا تقرر بھی اپنی رعایا کی خوشیوں اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے کیا ہے۔" بعض طریقوں سے اس کی انتظامیہ انقلابی طریق کار پر مبنی تھی۔ معاشی ترقی اور انصاف و اخلاقیات کو یقینی بنانے کے لیے اس نے امن کا قیام کیا۔ اس نے لوگوں کو رحم دلی اور مذہب کے لیے محبت کی تاکید کی۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے اپنے فرمان چٹانوں اور لاٹوں پر کندہ کروائے، چٹانوں پر کندہ فرامین اس کی وسیع حکومت کے بیرونی دائرے میں اور لاٹ سلطنت کی اہم شاہراہوں پر بنائے جاتے تھے۔

ان فرامین کو کندہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ تمام لوگ انھیں پڑھیں۔ اس کے لیے اشوک ایسے افسران کا تقرر بھی کرتا تھا جو ملک بھر میں گھومتے تھے اور دیکھتے تھے کہ فرامین لوگوں تک پہنچے یا نہیں۔ اپنی سلطنت میں سچائی، تمام جانداروں کے تئیں رحم دلی، خیرات، اساتذہ کی فرمانبرداری اور دوستوں کے تئیں بے تعصبی کے پیغام کو پھیلانے کے لیے وہ خود بھی سفر کیا کرتا تھا۔ دوسروں اور دوسرے فرقوں یا مذاہب کے لیے رواداری کا سلوک اس پالیسی کی سب سے بنیادی چیز تھی۔ اس نے اپنی رعایا کو ہدایت کی کہ وہ دوسروں کے عقائد کا احترام کریں۔

اشوک نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے منصوبہ تیار کیا اور پسماندہ طبقوں اور قدیم باشندوں کی فلاح و بہبود کے لیے وزارت کا قیام کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ غیر مغلوب سرحدوں کے لوگوں کو اس سے خوف نہیں کھانا چاہیے بلکہ انھیں چاہیے کہ وہ اس پر اعتماد کریں اور اس سے خوشی حاصل کریں نہ کہ تکلیف۔ اس نے بڑے پیمانے پر کنویں کھودنے اور آدمیوں و جانوروں کو سایہ فراہم کرنے کے لیے درخت لگانے کا پروگرام ترتیب دیا، اس کے علاوہ اس نے شاہراہوں پر مسافر خانے بھی بنوائے۔ اس نے اسپتال قائم کیے اور سبھی لوگوں کی عام بہتری کے لیے ادویاتی پودوں کی کاشت پر زور دیا۔ ایک وقت شاہی دسترخوان کے لیے بڑی تعداد میں جانوروں کو ذبح کیا جاتا تھا۔ اس نے اس تعداد کو کم کر کے دو موروں اور ایک ہرن کو ذبح کرنے کی اجازت دی۔ بعد میں ان تینوں کے ذبیحے پر بھی روک لگا دی گئی، اشوک نے جانوروں کی آختہ کاری اور مختلف تہواروں کے موقع پر کسی خاص مقصد کے لیے گھوڑوں پر لگائے جانے والے تجارتی نشان کی مذمت کی۔ یہ سبزی خوری کا آغاز تھا جو آنے والے دنوں میں پورے ملک میں پھیل گیا۔ قابل اہم بات یہ ہے کہ یہ بدھ کے پیغامات میں ایک طرح کا اضافہ ہے جب کہ ان کی زندگی میں یہاں تک کہ بھکشو بھی گوشت کھاتے تھے۔

اس طرح سے اشوک ان بادشاہوں میں سے ایک تھا جنھوں نے کسی پیغام کو آگے تک پھیلانے کا کام بخوبی انجام دیا۔ بدھ مذہب کے لوگ بھی اس عظیم بادشاہ کی یادگار کو عزیز رکھتے ہیں اور محبت سے اسے" پیاداسی" یا دیوتاؤں کا محبوب کہہ کر بلاتے ہیں۔

کسی دوسرے مذہب نے کسی بادشاہ کو ایسا اعزاز نہیں بخشا ہے۔ حالانکہ دنیا کی تاریخ میں بہت سے ایسے بادشاہ گزرے ہیں جنھوں نے ایسے لمبے چوڑے دعوے کیے تھے کہ وہ مذہب کے محافظ اور اس کے علمبردار ہیں۔ جن کا مقصد مذہبی پیشواؤں کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھا اور کچھ ایسے مذہبی رہنما بھی گزرے ہیں جو دنیاوی طاقت اور حیثیت حاصل کرنا چاہتے تھے، ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جسے عالمی سطح پر پیار کیا جاتا رہا ہو۔ اشوک نے نہ صرف یہ کہ خود ایک بھکشو کی طرح زندگی بسر کی بلکہ اپنے بیٹے اور بیٹی کو بھی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے بھیجا۔ اس کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا بادشاہ نظر نہیں آتا جو عوامی کاموں میں اتنی محنت کرتا ہو۔ اس نے تاکید کر رکھی تھی کہ" کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ خواہ میں کھانا کھا رہا ہوں، یا حرم سرا میں رہوں یا اپنے خلوت خانے میں آرام کر رہا ہوں یا سفر میں رہوں یا اپنے محل کے باغ میں رہوں، افسران کو چاہیے کہ وہ مجھے رعایا کے کاموں سے آگاہ رکھیں۔ کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ میں فلاح عام کے لیے ضرور کام کروں گا۔"

اس کے دادا کے زمانے میں نافذ کیے گئے" سخت قانونوں کو مکمل طور

سے ختم کر دیا گیا یا ان کے اثرات کو کم کر دیا گیا۔ تا کہ لوگ طمانیت کا احساس کر سکیں۔

اس نئے بدھ مذہب میں پیدا ہونے والی فرقہ بندیوں کو ختم کرنے کے لیے بھی بہت کچھ کہا اور مہاتما کے ان پیغامات کا دوبارہ احیا کرنے کے اقدام کیے جنھیں غفلت میں بھلا دیا گیا تھا۔

مہاتما کی موت کے دوسو سال کے بعد بدھ مذہب محض دوسری راہبانہ تحریک کی طرح ہی رہ گیا تھا۔ حالانکہ دونوں ریاستوں کے باہر بھی بدھ مذہب کی چھوٹی بستیاں آباد تھیں۔ لیکن ان کے کام مگدھ اور کوشل کے آشرموں میں ہی سمٹ کر رہ گئے تھے۔ مزید یہ کہ راہبانہ زندگی قومی زندگی کے اصل دھارے سے کوسوں دور تھی۔

بدھ کے نروان کے بعد سے بہت کچھ واقعات ہو چکے تھے۔ ان کے اقوال اور خطبات برسوں سے اساتذہ اور ان کے شاگردوں کے سینہ بہ سینہ چلے آرہے تھے۔ مہاتما کے اصل الفاظ کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں کوئی دھیان نہیں دیا گیا تھا اور نہ ہی ان کی اصل وضاحت کے لیے کچھ اقدام کیے گئے تھے۔ در اصل بدھ خود بھی اس قسم کے کسی خطرے سے واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے احکامات کی جانچ کے لیے ایک طریق کار کی طرف اشارہ کیا تھا۔ آخرکار ان کا ڈر درست ثابت ہوا۔ ان کے شاگردوں اور بھکشوؤں کے درمیان ان کے ذریعے استعمال کیے گئے اصل الفاظ اور ان کی تشریح کو لے کر اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

اس لیے مہاتما کی موت کے کچھ ہی دنوں بعد مذہبی کتابوں اور عقائد کو ان کی اصل شکل میں لانے کے لیے راجگیر میں ایک کونسل کا انعقاد کیا گیا۔ اس سے تنازعہ ختم نہیں ہوا۔ اگلے سو برسوں کے درمیان ایک بار پھر بھکشوؤں کے درمیان نظریاتی معملوں کو لے کر نا اتفاقی پیدا ہو گئی۔ مہاتما کے ذریعے استعمال کیے جانے والے ممکنہ اصل الفاظ کی مختلف توضیحات پیش کی گئیں۔ بھکشوؤں نے ان اختلافات کو سنگھ کے سامنے پیش کیا۔

مہاتما بدھ کے ایک سو سال بعد دوسری بودھ کونسل ویشالی میں منعقد کی گئی۔ یہ کونسل شاگردوں کے لیے بنائے جانے والے اصولوں کی قانون شکنی پر بحث کرنے کے لیے بلائی گئی تھی۔ اس میں ایک بار پھر تفرقہ پیدا ہوا جس کی بنا پر بدھ مذہب میں مختلف ذیلی فرقے قائم ہو گئے۔ بودھ ادب میں بدھ کے ماننے والوں کے تقریباً اسی فرقوں کا ذکر ملتا ہے۔ بعد میں ان فرقوں سے مزید ذیلی فرقے پیدا ہوئے۔

اس کے باوجود بدھ مذہب ایک طاقت کی طرح جاری رہا۔ موریاؤں کے حکومت میں آنے کے بعد اسے اور بھی تقویت حاصل ہوئی۔ متھرا، قنوج، کوشامبی وغیرہ جیسے چھوٹے بودھ علاقوں کی اہمیت بڑھ گئی۔ بودھ کی دوسری کونسل میں ان تمام جگہوں سے بھکشوؤں نے حصہ لیا تھا۔ اشوک نے اسے اور بھی بڑھاوا دیا۔

یہ اس کا شاہی امتیاز تھا جس کی وجہ سے بدھ مذہب پورے ہندستان میں پھیل گیا اور اسے آشرموں کے قیام کے لیے ملنے والے بڑے بڑے تحائف اور جاگیروں سے بھی مدد ملی۔ لیکن ہندستان میں بدھ مذہب کی اصل توسیع اس وقت ہوئی جب اشوک نے اس کے اصولوں کو عام رعایا کے لیے ضابطۂ اخلاق بنا دیا۔ آشرموں کی جاگیروں میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ ان کو ملنے والے تحائف اور سہولیات ایسی تھیں کہ اکثر غیر بودھ لوگ بھی سنگھ میں شامل ہونے کے لیے آگے آئے۔ اس سے آرام و آسائش کی زندگی کا آغاز ہوا جس کا مطلب تھا سہولیات کا غلط استعمال۔

مذہبی قوانین کی درستگی کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے، جو مختلف فرقوں کے وجود میں آجانے سے خطرے میں نظر آرہا تھا، اشوک نے پاٹلی پتر میں ایک تیسری کونسل منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ تستا ماگلی پتا، جو بدھ مذہب کے اندر غلط عقائد کے شامل ہو جانے سے بے حد فکر مند تھا، وہ فرقہ پرستوں اور منافقوں کو باہر نکالنے میں کامیاب رہا۔ اس نے اصل عقیدے کا دوبارہ احیا کیا۔

اس کونسل کا سب سے اہم رول یہ تھا کہ اس نے مختلف فرقوں کے درمیان چلے آرہے پرانے تنازعوں کو ختم کر دیا، اور یہ شاید دنیا کی تاریخ کا ایک اہم رخ تھا کہ کونسل کے ختم ہونے کے بعد، ہندستان کے باہر بدھ کی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے مذہبی مبلغین کو بھیجا جانے لگا۔ اشوک نے اپنے بیٹے مہندر اور بیٹی سنگھ مترا کی خدمات اس عظیم کام کے لیے پیش کیں۔ ان دونوں کو سری لنکا بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ مبلغین کے دستے دور دراز ممالک جیسے شام، مصر اور یونان وغیرہ بھی پہنچے۔ اس طرح اشوک نے ان ممالک میں بدھ مذہب کی توسیع کے لیے راستہ ہموار کیا جو اس کی تقلید کرتے تھے۔ جیسے کنشکا سے وسط ایشیا، جاپان، چین، تبت، برما، تھائی لینڈ، کمبوڈیا اور دوسرے ممالک۔

355, Jhelum Hostel,
JNU, New Delhi

□□□

ہری چند اختر

ڈاکٹر تاثیر

لاہور کے ایس پی ایس کے ہال میں انجمن ارباب علم کا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ سامعین کی پہلی قطار میں موٹے موٹے خدوخال کا ایک صحت مند نوجوان ڈھیلا ڈھالا سفید کرتا اور شلوار پہنے اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا شاعروں کو ایسی ''بیداد'' سے نواز رہا تھا جو بیداد گر کی بالغ نظری اور مہارت فن کی آئینہ دار تھی۔

یہ شخص ایک اور وجہ سے بھی میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ میرے لیے یہ مشاعرہ ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مجھے لاہور آئے ساڑھے چار سال ہو چکے تھے اور میں مشن کالج سے بی اے کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ اس دوران میں مقامی کالجوں کے بے شمار مشاعروں اور شہر کی دوسری ادبی محفلوں میں شریک ہوا۔ اخباروں اور رسالوں میں بھی لکھنے لگا تھا اور اس طرح کچھ شہرت یا رسوائی بھی حاصل ہو گئی تھی۔ مگر اب تک اس ''بڑے'' مشاعرے میں دوسروں کا کلام سننے کے لیے ہی شامل ہوتا رہا تھا۔ انجمن ارباب علم کے کرتا دھرتا مولانا تاجور نجیب آبادی کی ہنگامہ پسند طبیعت نے اس مشاعرے کو ''سردجنگ'' کا میدان بنا دیا تھا۔ وہ یوں کہ عام دستور کے خلاف یہ مشاعرہ طرحی تھا اور اعلان کیا گیا تھا کہ بڑے بڑے استادوں کو چھوڑ کر جس کی غزل سب سے اچھی قرار پائے اسے ''لسان الاعجاز'' کا خطاب دیا جائے گا۔ میں ہمیشہ اس قسم کے مقابلوں کا مخالف رہا ہوں۔ مگر حضرت حفیظ جالندھری نے کہا کہ مقابلے میں شامل ہونا یا نہ ہونا تمہاری مرضی پر موقوف ہے لیکن غزل ضرور پڑھو۔ پس میری حیثیت ایک ''پرانے نو وارد'' کی تھی جو اپنا ماضی اور مستقبل داؤں پر لگانے آیا ہو۔ اس لیے قدرتی طور پر یہ نوجوان مجھے ایک ہوا معلوم ہوا اور میں بڑے غور سے اس کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے لگا۔

مجھے اسٹیج پر بلایا گیا اور میں نے اس نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پڑھنا شروع کیا۔ مطلع خیر و عافیت سے گزر گیا تو میں نے دوسرا شعر زیادہ اعتماد اور جوش کے ساتھ پڑھا۔ اب یہ بھی لاابالی پن چھوڑ کر پوری توجہ سے سننے لگا اور غزل ختم ہونے تک میں اس سے حسب خواہش مگر خلاف توقع داد وصول کر کے آئندہ تعلقات کی بنیاد استوار کر چکا تھا۔

تیسرے چوتھے دن انارکلی بازار میں چلے آ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکراتا ہوا چہرہ اور بھی شگفتہ ہو گیا۔ سلام میں بھی پہل کی، خلوص بھری بے تکلفی سے بولے ''میں تاثیر ہوں۔ آپ کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے ہی کالج کے پرانے طالب علم اور نئے گریجویٹ ہیں۔ بھئی بہت اچھی غزل تھی آپ کی!'' انداز میں مربیانہ حوصلہ افزائی اور بزرگانہ شفقت فشانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔ پھر بھی میں نے رسمی طور پر شکریہ ادا کر کے کہا۔ ''یہ تو آپ کا حسن سماعت ہے۔'' تاثیر کھلکھلا کر ہنسے اور کہنے لگے۔ ''میرے حسن سماعت کا مظاہرہ تو آپ اس روز دیکھ ہی چکے ہیں، نہیں بھائی تمہاری غزل واقعی اچھی تھی۔ بہت اچھی تھی!''

یوں تاثیر سے میری پہلی ملاقات دو قسطوں میں ہوئی۔ لیکن اس کے بعد اخلاص و محبت کے مرحلے اس قدر تیزی سے طے ہوئے کہ ڈیڑھ دو سال کی مدت میں بھائیوں کا سا پیار اور بچپن کے ہم جولیوں کی سی بے تکلفی ہو گئی۔

رند ہزار شیوہ

تاثیر ہمارے دور کے ان معدودے چند نوجوانوں میں سے تھے جنھیں مشرقی اور مغربی علوم سے یکساں شغف تھا۔ قدیم و جدید علوم والسنہ کے متوازن مطالعہ نے انھیں جامع کمالات بنا دیا تھا۔ ان کی دلچسپیوں اور مصروفیتوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ابھی شعر و شاعری کے چرچے ہیں تو تھوڑی دیر بعد کسی ملک کی داخلی و خارجی سیاسیات پر بحث ہو رہی ہے۔ ابھی کالج میں اپنے شاگردوں کو تنقید عالیہ سے روشناس کرا رہے تھے اور ابھی کبڈی یا گلی ڈنڈے کا میچ ملاحظہ فرمایا جا رہا ہے۔ ابھی یونیورسٹی سینٹ کے اجلاس میں نہایت دقیق علمی و انتظامی مسائل پر نپے تلے جملوں میں اظہار رائے کر رہے ہیں اور ذرا سی دیر میں موسیقی یا لطائف وظرائف کی محفل میں قہقہے لگاتے نظر آتے ہیں۔ ان کے بے تکلف عادات و اطوار، لاابالیانہ انداز اور بے پروایانہ حرکات سے ایک آدھ بار ملنے والوں کو سخت مغالطہ ہوتا تھا اور تاثیر نے بھی اس مغالطے کے امکان کے خیال سے کبھی اپنی روش بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ تاثیر کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوا۔ بعض لوگ اس احساس کے زیر اثر اپنے آپ پر بڑائی وارد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کوشش ان پر کچھ اس طرح طاری ہو جاتی ہے کہ بے چارے اس مقام کو بھی کھو بیٹھتے ہیں جس کے وہ جائز طور پر مستحق ہوتے ہیں۔ تاثیر کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ اور احساس تھا۔ چنانچہ صلاحیتوں کے اس احساس نے ان میں ایک بہت بڑی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ وہ نہ صرف دوسروں کی صلاحیتوں کی داد دے سکتے تھے بلکہ جہاں فضیلت نظر آئے وہاں کھلے دل سے اعتراف بھی کر سکتے تھے۔ غرض یہ شخص ہزار پہلو شخصیت کا مالک تھا اور جس محفل میں چلا جائے سر آنکھوں پر جگہ پاتا تھا۔

نیرنگ خیال، چغتائی، اقبال

بزم ادب کے قیام سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ لاہور کے متعدد سرکردہ ادیب غیر محسوس طور پر ایک منظم گروہ کی صورت میں یکجا ہو گئے۔ حکیم یوسف حسن نے ان دنوں رسالہ نیرنگ خیال جاری کیا تھا۔ سب اس میں لکھنے لگے۔ لیکن تاثیر مستقل مضمون نگار تھے۔ وہ عبدالرحمٰن چغتائی اور ان کے آرٹ کو اردوداں پبلک سے متعارف کرانے میں منہمک تھے اور یہ انہماک ان دنوں

تاثیر کی زندگی کے واحد مشن کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ڈاکٹر اقبال سے تاثیر کو والہانہ محبت اور عقیدت تھی اور اقبال کے پیغام کی تبلیغ اور کلام کی تفسیر میں وہ اپنی تمام تر علمی و ادبی صلاحیتیں صرف کر دیا کرتے تھے۔ ہم سب چغتائی آرٹ کے مداح اور علامہ اقبال کے عقیدت مند تھے۔ مگر تاثیر کو چھیڑنے کے لیے دوستوں کی مخصوص محفلوں میں ان بزرگوں پر بھی ''زبان صاف'' کرنے لگتے۔ اس وقت تاثیر کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ اور ان کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ ایک دن صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے مکان پر چھ سات دوست جمع تھے۔ تاثیر آئے تو تبسم نے فوراً اٹھ کر ایک بازو آگے اور ایک پیچھے کو پھیلا کر ہاتھوں کی انگلیاں اکڑا لیں۔ جسم ذرا آگے کو جھکا لیا۔ گردن ٹیڑھی اور آنکھیں نیم باز۔ اور کڑک کر بولے۔ ''آئینۂ حرم۔ عمل چغتائی'' (نیرنگ خیال میں چغتائی صاحب کی تصویروں کے نیچے اسی قسم کے نام اور ''عمل چغتائی'' کے الفاظ لکھے جاتے تھے) دوستوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ تاثیر جھینپنے والے دن تو پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ لمحہ بھر کے لیے ایک خفیف سی خفت چہرے پر نمودار ہوئی اور مطلع صاف ہو گیا۔ بڑی سنجیدگی سے بولے۔ ''بھئی صوفی سنا ہے پرسوں تم ایک مذہبی مشاعرے میں شریک ہوئے اور بہت ہی پست اشعار سنائے!'' میں نے صفائی پیش کی۔ ''بھئی وہ محفل ہی اس قابل تھی۔ ایک سے ایک بڑا جاہل دھرا پڑا تھا وہاں!'' مسکرا کر بولے۔ ''جیسے وہاں سخن فہم تھے ویسے ہی یہاں مصوری کے قدرشناس جمع ہیں!'' میں نے کہا۔ ''جی ہاں۔ واقعی ہم اس آرٹ کو نہیں سمجھ سکتے مثلاً دیکھیے نہ۔ دریا کے کنارے رانجھا کھڑا ہے اور اس کا قد دریا کے پاٹ سے بڑا ہے۔ چناب کو عبور کرنے کے لیے صرف ایک قلابازی درکار ہے۔'' ایک لحظہ کے لیے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی جیسے میری بات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ مگر فوراً ہی بزرگانہ سنجیدگی سے ارشاد فرمایا ''تم بہت اچھے شاعر ہو۔ شعر کہا کرو۔''

تاثیر انگلستان میں

تاثیر اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہوئے تو وہاں ڈاکٹر سعید اللہ، پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر عبدالواحد اور محمود نظامی کی معیت میں بزم فروغ اردو قائم کی جس کی رکنیت کا فخر مجھے بھی حاصل تھا۔ لیکن یہ بڑی داستان ہے پیارے! اس لیے پھر کبھی سہی۔ یہاں سے تاثیر انگلستان میں پی ایچ ڈی ہونے گئے وہاں سے اکثر دوستوں کو بہت مزے کے خطوط لکھتے رہے۔ ان خوش قسمت احباب میں میں بھی شامل تھا۔ ایک مرتبہ خط آیا جس میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی طویل خاموشی کا شکوہ کر کے لکھا تھا کہ صحافی تک ایک شعر پہنچا دو اور بس۔ شعر یہ تھا:

خط نہیں آیا مہینے ہو گئے
تم تو بالکل ہی کمینے ہو گئے

میں نے ایک خط میں اپنی تازہ غزل لکھ بھیجی۔ کوئی مہینہ بھر کے بعد اسی زمین میں چھ سات سخت پاکیزہ قسم کے اشعار ''پیروڈی'' کی صورت میں نازل ہو گئے۔ اس پر میں نے بھی بھنا کر ایک نئی غزل لکھی جس پر پورا زور طبع صرف کیا گیا تھا۔ غزل واقعی اچھی تھی۔ تاثیر نے میرے خط کے جواب میں اور باتوں کے علاوہ غزل کی بھی بہت تعریف لکھی۔ مگر چند روز بعد ایک اور خط آ گیا۔ اسی زمین میں آٹھ اشعار تھے اور ہر شعر جعفر زٹلی اور عبید زاکانی کو کان پکڑوا دینے کے لیے کافی تھا۔

شادی

انگلستان سے آئے تو مجرد سے مضاعف ہو چکے تھے۔ لاہور میں ڈاکٹر اقبال نے تاثیر اور کرسٹابل کا نکاح پڑھایا۔ تین بچے ہوئے۔ دو لڑکیاں سلمیٰ اور مریم۔ لڑکے کا نام سلمان رکھا گیا۔ تاثیر کو بچوں سے محبت نہیں عشق تھا۔ ان کی موجودگی میں وہ سب کچھ بھول جاتا تھا اور بالکل ہم جولیوں کی طرح ان کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اس وقت تاثیر کی حرکات دیکھ کر کسی شخص کا یہ قول یاد آ جاتا تھا کہ انسان دو موقعوں پر پاگل ہو جاتا ہے۔ ایک آئینہ دیکھتے وقت، دوسرے اپنے بچوں سے کھیلتے ہوئے۔

ہماری حیثیت

اس گھر میں میری اور تاثیر کی حیثیت عجیب و غریب تھی۔ یعنی فرداً فرداً ہم دونوں کو بہت شریف اور معقول آدمی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بیگم تاثیر کی یہ پختہ رائے تھی کہ ہم دونوں اکٹھے ہوں تو شریفانہ گفتگو کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ تاثیر نقرس میں مبتلا ہو کر خانہ نشیں تھے۔ میں بھی دلی میں تھا۔ ٹیلی فون آیا۔ ''میں ہوں کرس!'' (کرسٹابل بیگم تاثیر) میں نے کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' جواب ملا۔ ''بات سنو، تاثیر بیمار ہے اور بہت اداس ہے۔ فوراً چلے آؤ اور اس کے ساتھ کچھ بیہودہ باتیں کرو۔'' میں نے کہا۔ ''پھر کیا ہوگا!'' قہقہہ لگا کر بولیں۔ ''وہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' یوں بھی جب کبھی ہم دونوں آپس میں قہقہے لگا رہے ہوں اور کرس آ جائے تو تاثیر ہمیشہ ایک ہی سوال کرتے۔ ''بتاؤ ہم کس بات پر ہنس رہے ہیں؟'' اور اس کا ایک ہی جواب ملتا۔ ''کچھ گندی بکواس ہو گی اور کیا؟''

بے چاری کرس! تقسیم ملک کے بعد پہلی مرتبہ لاہور میں ملاقات ہوئی تو یہ چہکتی ہوئی بلبل بیوہ ہو کر محبوب خاوند کی نشانیوں کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ اپنی صحت کا خدا حافظ ہے۔ مگر بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جان لڑا رہی ہے۔ میں نے کارڈ اندر بھیجا۔ ایک منٹ کے بعد ایک مسرت بھری چیخ کے ساتھ کرس دروازے پر آ پہنچی۔ بچوں سے ملایا۔ ''یہ ڈیڈی کے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں!'' تاثیر کا مجموعۂ کلام ''آتشکدہ'' کے نام سے چھپا ہے۔ اس کی ایک جلد لا کر تینوں بچوں کے دستخط کرائے۔ پھر اپنے دستخط کر کے مجھے دی۔ میرے لیے یہ کتاب ایک متاع عزیز ہے۔۔۔ کاش اس پر محمد دین کے دستخط بھی ہوتے۔

(بشکریہ ''آج کل''، دسمبر 2004)

اظہار احمد ندیم

تنویر احمد علوی سے گفتگو

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا شمار برِ صغیر کے جیّد عالموں اور محققین میں ہوتا ہے۔ آپ کی پیدائش 16/جولائی 1927کو کیرانہ،ضلع مظفر نگر' یو۔پی میں ہوئی۔ آپ کی ہائی اسکول سے ایم۔ اے تک کی تعلیم میرٹھ میں ہوئی۔1960میں آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال دہلی کالج میں لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔بعد ازاں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بحیثیت صدر وابستہ رہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا اسلامیات، تصوف، تاریخ اور ہندستانی تہذیب و ثقافت کا وسیع مطالعہ ہے اور اسی تناظر میں آپ کے متعدد تحقیقی و تنقیدی مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

آپ تقریباً تیس کتابوں کے مصنف ہیں جو مختلف موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ غالب، عہدِ غالب اور معاصرینِ غالب پر آپ کی کتابیں اور بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ غالبؔکے فارسی خطوط کا ترجمہ "اوراقِ معانی" کے نام سے بھی شائع ہوا۔

ملک اور بیرونِ ملک میں آپ نے مختلف موضوعات پر توسیعی خطبے دیے ہیں اور سیمناروں میں شرکت کی ہے۔ آپ کو دہلی اردو اکادمی ایوارڈ، یوپی اردو اکادمی ایوارڈ کے علاوہ ہریانہ اردو اکادمی کے سب سے بڑے اعزاز (حالی ایوارڈ) سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ حال ہی میں آپ کو اردو اکادمی' دہلی کے سب سے بڑے ادبی انعام بہادر شاہ ظفرؔ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔آپ کی چند معروف تصنیفات و تالیفات درج ذیل ہیں:

1.انتخاب مثنویات اردو(1961)، 2. انتخاب قصائد اردو (1961)، 3.ذوقؔ سوانح اور انتقاد(1963)، 4. کلیات ذوقؔ (دو جلدیں) (1967)، 5. تاریخِ محمود (1967)، 6. کلیات شاہ نصیر (تین جلدیں) (1976-1971)، 7. صحیفۂ ابرار (1976)، 8. اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن (1978)، 9. اردو میں بارہ ماسے کی روایت (1988)، 10.اوراقِ معانی (1993)، 11. رقصِ لمحات (1998)، 12. جنوب مغربی ایشیا میں ہمارا تہذیبی ورثہ (2001)، 13. نقشِ نیم رخ (2002)، 14. تجسس سے تجزیہ تک (2002)۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی سے گفتگو قارئین " اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: ادبی تحقیق کے گرتے ہوئے معیار پر آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہمارے یہاں تحقیق کی کمزوری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بیشتر نئے طلبہ عربی، فارسی، ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں سے بالکل واقفیت نہیں رکھتے جس کے باعث ان کی نظر دور تک نہیں جاتی۔ اب کوئی بھی صنفِ شعر وادب ہو جب تک آپ اپنے ماحول میں قریب اور دور یہ تلاش نہیں کریں گے کہ اس کے نمونے کہاں کہاں دستیاب ہیں اور کس کس شکل میں ہیں، اس وقت تک آپ صحیح نتائج تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ دوسری بات یہ کہ اگر آپ کو زبان پر قدرت نہیں ہے تو اگر آپ تحقیق کر بھی لیں گے تو اس کو صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتے۔ ایک محقق کے پیرایۂ زبان اور ایک انشا پرداز کے اسلوب میں جو فرق ہوتا

ہے، اسے بعض لوگ ملحوظ نہیں رکھتے۔

سوال: تحقیق کی بنیادی شرط کیا ہے اور اس کی زبان کیسی ہونی چاہیے؟

جواب: سب سے اہم یہ ہے کہ کسی طالب علم کو کوئی موضوع دینے سے پہلے اسے تقابلی مطالعے کے معنی اچھی طرح سمجھا دیے جائیں۔ اس لیے کہ اخذ نتائج میں تقابلی مطالعہ بہت مدد کرتا ہے۔

طالب علم کو یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ جذباتی اندازِ نظر تحقیق میں کام نہیں دے گا۔ آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے اس میں سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا ہے۔ ایک بات جو مجھے بہت بری لگتی ہے وہ یہ کہ آپ کسی کا بھی ذکر کرتے وقت Superlative کیوں استعمال کرتے ہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مناسب

الفاظ رکھیے۔ اس کا طرز عظیم الشان ہے کہ جگہ آپ یہ کیوں نہ کہیں کہ اس کے طرز میں کشش ہے، ایک طرح کی بلند آہنگی ہے، پُرشکوہ انداز ہے۔ اب فرض کیجیے اگر بات کسی ایسے شخص کی ہے، ایسی کتاب کی ہے جس میں ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں تو پھر ایک ہی طرز اظہار پر آخری Comment نہ دیجیے۔

سوال: آپ کی نظر میں ہندستان میں اردو تحقیق کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: آنے والی نسل کس طرح کی ہوگی، محنت پسند کرے گی یا نہیں، ایک سے زیادہ زبانوں کو اپنے لیے ضروری سمجھے گی یا نہیں، نئے حقائق تک پہنچنا اس کی دل چسپی کا سبب ہوگا کہ نہیں۔ یہ تو اس پر منحصر ہے۔ میرے زمانے سے پہلے پروفیسر حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور دوسرے اسکالرز نے جو معیار قائم کیا تھا، میرے زمانے کے محققین نے اس میں ایک طرح کا نکھار پیدا کیا۔ میں تحقیق کا ایک معمولی طالب علم ہوں لیکن میں نے اصولیاتِ تحقیق پر بنیادی کتاب لکھی اور اس کا دوسرا حصہ جواب لکھا گیا ہے، باقی مسائل سے متعلق ہے یہ کام گویا پہلی نسل کے بعد ہوا۔ اب ہمارے بعد کی جو نسل ہے، آنے والوں کی جو نسل ہے یہ تو اس کے Attitude پر ہے۔ کتابوں کی کمی نہیں ہے۔ اساتذہ بھی مل جائیں گے لیکن اگر نئی نسل محنت ہی نہ کرنا چاہے تو کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن یہ سوچا جاسکتا ہے کہ جب تک ہم اندازِ فکر نہیں بدلیں گے، تحقیق کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔

سوال: پاکستان میں تحقیق کی کیا صورتِ حال ہے؟

جواب: پاکستان میں تحقیق کی صورتِ حال یہاں سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ یہ ہے کہ وہاں اردو، سرکاری زبان ہے۔ اس لیے وہاں اسکالرز زیادہ ملتے ہیں اور بعض اسکالر بہت ممتاز ہیں جیسے وحید قریشی، مشفق خواجہ، جمیل جالبی، فرمان فتح پوری وغیرہ۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بہت آگے نکل گئے ہیں۔ پاکستان میں مشفق خواجہ نے اپنی پوری زندگی تحقیق کے لیے وقف کردی تو اس کے نتائج تو بہرحال ہیں مگر وہ شخصی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی اس طرح کے نتائج الگ الگ شخصیات میں مل سکتے ہیں۔

سوال: ان دنوں آپ کوئی تحقیق کام کررہے ہیں؟

جواب: ان دنوں تو میں کئی تحقیق کام کر رہا ہوں۔ ایک تو یہ کہ اردو شاعری کے روایتی ادارے، کردار، علامتیں اور ان کے معنی کیا ہیں۔ دوسرا وہی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا کہ اصولیاتِ تحقیق پر نئی کتاب لکھ چکا ہوں اس کا تکمیلی حصہ باقی ہے۔ اس کے علاوہ غالب پر جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ لے رہا ہوں کہ وہ کس نوعیت کا ہے۔ اس کے ایک باب میں غالب کے سوانح نگاروں کا جائزہ لیا ہے، تجزیہ بھی کیا ہے اور ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ میں نے مختلف ابواب میں غالب کے محققین، ناقدین اور شارحین کو سامنے رکھا ہے۔ اس طرح میرے تحقیقی کام کے کئی دائرے ہیں جو پانی کے دائروں کی طرح متحرک ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں۔

سوال: آپ نے بتلایا کہ آپ غالب پر کام کررہے ہیں، نئی نسل کو غالب پر کام کرتے وقت کن باتوں پر توجہ دینی چاہیے؟

جواب: سب سے پہلے تو وہ ان چیزوں کا ایک ناقدانہ جائزہ لے جواب تک سامنے آئی ہیں۔ یہ دیکھے کہ اور کون کون سے نئے پہلو نکلتے ہیں۔ غالب کے فارسی خطوط کے ترجمے کے بعد کیا حقائق سامنے آئے۔ وہ نئے حقائق پھر کس طرح سے آئندہ Interpret ہوسکتے ہیں۔ کمال احمد صدیقی نے مجھے ایک ملاقات میں یہ بتایا کہ غالب نے اپنے بارے میں جو بیانات دیے ہیں تاریخ ان کی گواہی نہیں دیتی۔

غالب فارسی کو بہت ترجیح دیتے ہیں، کیا واقعتاً انھوں نے فارسی میں قصائد حمد و نعت و منقبت کے ماسوا جو قصائد لکھے ہیں وہ اسی درجے کے ہیں کہ ان کو دوسروں سے فائق قرار دیا جائے۔ غالب کی سوانح، غالب کی سیرت، غالب کے ماحول اور غالب پر اس کے زمانے کے اثرات، ان سب کا تجزیہ نئی نسل اپنے طور پر کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کی لغات کو دیکھنا ہوگا۔ اس سے میری مراد غالب کی تشبیہات، استعارات، لفظی ترکیبیں وغیرہ ہیں۔ ان پر وہ کام نہیں ہوا ہے جو ہونا چاہیے۔

سوال: ایسا کوئی تحقیقی کام جسے آپ نے بہت پہلے سوچا ہو لیکن اسے اب تک نہیں کر پائے ہوں؟

جواب: اس طرح کے بہت سے موضوع ہیں۔ مثال کے طور پر ہم نے ہندوی شاعری کو جو اپنی طرف سے نذرانے پیش کیے ہیں یعنی اردو میں ہندوی اصناف کے تجربے ان پر ہم نے کوئی کام نہیں کیا۔ ہم نے لوک گیتوں، لوک کتھاؤں پر کوئی تحقیقی کام نہیں کیا جو بے حد ضروری تھا۔ ہم نے اردو شاعری کی تشبیہات و استعارات کی اہمیت، انفرادیت اور لسانی ضرورتوں پر بھی گفتگو کم کی ہے۔

سوال: آپ اردو کے کن کن شاعروں پر تحقیق زیادہ ضروری سمجھتے ہیں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ ہر دور کے اہم شاعروں پر کام ہونا چاہیے۔ قدیم دکنی شاعری کا مطالعہ ہونا چاہیے جو نہیں ہو پایا ہے۔ سودا کے علاوہ دوسرے شعرا خاص طور پر میر کی نفسیات اور تاریخی حسیت پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: آپ نے کہا کہ میر کی نفسیات اور تاریخی حسیت پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے "شعر شور انگیز" کے نام سے جو کام کیا ہے کیا وہ آپ کی

نظر سے گزرا ہے؟

جواب: شمس الرحمان فاروقی کے کام کی نوعیت دوسری ہے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ میر کی تاریخی حیثیت کیا ہے، کن حوالوں سے وہ بات کرتے ہیں اور ان حوالوں کا ہمارے ذہن کو بدلنے، بنانے، تعمیر و تخریب میں کیا حصہ ہے۔ یہ مطلب تھا۔ فاروقی صاحب کا کام تو اپنی جگہ ہے۔ میر پر خواجہ احمد فاروقی نے اور نثار احمد فاروقی نے اس سے پہلے کام کیا تھا۔ لیکن میر کی شخصیت کو تاریخ کے وسیع تر اور گہرے تناظر میں دیکھنے کی مزید ضرورت ہے۔

سوال: یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آپ نے طبابت بھی کی ہے۔ حکمت سے تحقیق کی طرف آپ کس طرح آئے؟

جواب: میں شروع ہی سے مطالعے کا عادی رہا۔ اس زمانے میں جب میں طب کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، تب بھی تحقیقی نقطۂ نظر سے چیزوں کو دیکھتا تھا۔ تحقیق میری ضرورت نہیں تھی۔ ہوا یوں کہ ایک کتاب پڑھی تو پتہ چلا کہ دوسری کتاب میں بہت سی باتیں ہیں، تیسری میں اور نئے پہلو ہیں تو میں پڑھتا ہی چلا گیا۔ آج بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ مطالعے کے شوق کے علاوہ تحقیق کے لیے مجھے کسی محرک کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

سوال: اب طبابت سے آپ کا تعلق کہاں تک رہ گیا ہے؟

جواب: میرے والد حکیم تھے۔ ان کی کتابیں شروع ہی میں، میں نے پڑھ لیں جو انھوں نے پڑھی تھیں۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ بیمار لوگوں کو صحت کی طرف لانا بہت بڑی نیکی ہے تو میں طب کی طرف مزید متوجہ ہوا۔ طب کے امتحان میں میں نے پٹیالہ طبیہ کالج کا رکارڈ توڑا۔ ایک دن اچانک میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر میں فنِ طب کو عملاً اختیار کروں گا تو مجھے مریضوں سے پیسے لینے پڑیں گے یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں آج بھی کسی شخص سے، شخصی طور پر کچھ بھی نہیں لیتا کوئی معاوضہ کسی خدمت کا، کسی کام کا نہیں۔ صرف سرکاری اداروں سے جو معاوضہ تھوڑا بہت مل جاتا ہے وہ لے لیتا ہوں۔ اس لیے میں نے طب کو بہ طور پیشہ اختیار کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔

سوال: ویسے تو ہماری زندگی واقعات سے بھری ہوتی ہے لیکن آپ اپنی زندگی کا ایسا کوئی واقعہ سنائیں جس کو آپ بھول نہیں سکے۔

شخصیات مجھے بہت زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ ان کی گفتگو کے اچھے جملے، ان کی صحیح Approach مجھے یاد رہتی ہے۔ جب میں ریسرچ کرنے علی گڑھ گیا تھا تو پروفیسر سرور مرحوم نے میری کس طرح مدد کی تھی، مجھے یہ یاد ہے۔ میرا Viva لینے کے لیے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب آئے تھے اور مجھ سے متاثر ہو کر گئے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر میرے لیے امتیاز علی تاج سے کچھ نہ کچھ کہا کرتے تھے اور جب میں نے مولانا کی خدمت میں حاضری دی تو اپنے کانوں سے سنا He speaks superlative about me اب یہ بھول جانے والی چیز نہیں ہے۔ انھوں نے میرے ترتیب کردہ کلیاتِ ذوق پر جو مقدمہ لکھا، آج بھی اس کو پڑھ کر فخر کرتا ہوں اور رو پڑتا ہوں کہ ایک اتنا بڑا عالم مجھ پر اتنا مہربان تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے "آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ" جب دوبارہ نئے ایڈیشن کے طور پر مرتب کیا تو اس میں میری معلومات کو شامل کیا۔ اب یہ معمولی واقعہ تو ہے نہیں کہ کوئی اتنا بڑا محقق اپنے طالب علم کی معلومات کو اپنی کتاب میں جگہ دے۔ یہ سب باتیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

سوال: آپ شاعری بھی کرتے ہیں۔ ایک شاعر اور محقق تنویر احمد علوی میں کیا فرق ہے؟

جواب: اصل میں ذہن کے کئی رخ ہوتے ہیں مثلاً ایک شخص محقق ہونے یا اصولیاتِ تحقیق کا آدمی ہونے کے باوجود جذباتی رشتے بھی تو رکھتا ہے، حسیاتی رشتے بھی تو رکھتا ہے۔ یہ رشتے افراد کے ساتھ ہیں، ادوار کے ساتھ ہیں ان پر گفتگو بغیر شاعری کے نہیں ہوسکتی۔ شاعری، تحقیق کرنے والے کے لیے نہ کوئی بری بات ہے نہ کوئی بڑی بات ہے بلکہ اس کی شخصیت کا ایک عکس ہے۔

سوال: اپنی تازہ غزل کے چند اشعار "اردو دنیا" کے قارئین کو سنانا پسند کریں گے؟

جواب تین شعر سناتا ہوں:

غمِ جاں کا وہ چارہ ساز بھی ہے
دل شکن بھی ہے دل نواز بھی ہے
آتشِ رنگ اور حنا کی طرح
دل کی ٹھنڈک، جگر گداز بھی ہے
حسنِ تخلیق شیشہ گر بھی ہے
دستِ فن کار شیشہ باز بھی ہے

سوال: تحقیق اور شاعری کے علاوہ آپ کی کیا دلچسپی ہے؟

جواب: مجھے تہذیبی مطالعے سے بہت دلچسپی ہے۔ اس پر میں نے کام بھی بہت کیا ہے۔ اردو میں غالباً سب سے زیادہ کام میں نے کیا ہے۔ آپ میری کتاب "جنوب مغربی ایشیا میں ہمارا تہذیبی ورثہ" دیکھیے؟ بارہ مولہ کی فلاسفی، اس کے تہذیبی رجحانات، اس کے علاقائی Development پر جو کام میں نے کیا ہے وہ مزید آگے بڑھانے کا کام ہے اور مجھے اس سے دلچسپی ہے۔

سوال: آج جب کہ قدریں مٹتی جارہی ہیں ایسے میں اردو تہذیب کہاں تک زندہ رہ پائے گی؟

جواب: میں کہہ نہیں سکتا ایسا بھی ہوتا ہے کہ:

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

یہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو والے اپنے فرائض انجام نہیں دے رہے ہیں۔ یہ افسوسناک بات ہے کہ ہمارے اساتذۂ اردو، اسکولوں کی سطح پر، کالجوں کی سطح پر، یونیورسٹیوں کی سطح پر، اپنی ذمے داریوں کو پورا نہیں کررہے ہیں۔ اردو کی بقا کی جدوجہد، تعلیم و تدریس کی صورت میں کرنا ضروری ہے۔ اس کی طرف ہمارے قدم بہت سستی سے اٹھ رہے ہیں بلکہ کہیں کہیں تو بالکل جمود کا عالم ہے۔

سوال: ان دنوں ایسے شاعروں اور ادیبوں پر تحقیق کی جارہی ہے جو ابھی زندہ ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: یہ بہت بنیادی اور اہم سوال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ہر افسانہ نگار، ہر شاعر پر تحقیق کے نام سے کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم اشخاص پر کام کرتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ ہم ایک سے زیادہ افراد کو لیں اور ان کا تنقیدی، تجزیاتی، نفسیاتی مطالعہ کریں۔ میں نے بعض طالب علموں سے بات کی تو انھوں نے کسی کا نام لے کر کہا کہ ہم فلاں کی غزل گوئی پر تحقیق کررہے ہیں۔ میں اس طرح کی تحقیق سے متفق نہیں ہوں۔ It is not research at all, And it should not be regarded as a research.

سوال: رشید حسن خاں کے تحقیقی طریقۂ کار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: رشید حسن خاں تحقیق کے ان لوگوں میں سے ہیں جن کو Pure Researcher کہا جاسکتا ہے۔ پھر انھوں نے زبان کے بنیادی مسائل پر بات کی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کام کیا ہے وہ ٹھوس کام کیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ممتاز محقق ہیں۔

سوال: ماہنامہ "اردو دنیا" کے قارئین کے نام آپ کا کیا پیغام ہے؟

جواب: آپ اردو کی طرف متوجہ ہوئیے۔ اپنے بچوں کو اردو پڑھائیے، اردو اخباروں اور کتابوں کے مطالعے کی عادت ڈالیے۔ ایسی ادبی تقریبات کا اہتمام کیجیے جن میں شریک ہوکر اردو نہ جاننے والوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب ملے۔

243, Jhelum Hostel, JNU, New Delhi-110067

□□□

دھوپ چولھا

مصنف: ایم. ایم. ہدیٰ/مترجم: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

توانائی کے بحران نے قدرتی وسائل کی طرف پھر سے انسان کی توجہ مرکوز کی ہے۔
دھوپ چولھا یا سولر کوکر کی ایجاد اس کی تازہ مثال ہے۔ اس کتاب میں دھوپ چولھا تیار کرنے کے سلسلے میں کیے گئے مختلف تجربات اور ان کے نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔
کتاب میں دھوپ چولھا بنانے کا طریقہ اور کوکر میں مختلف کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی بتائی گئی ہیں۔

صفحات: 100، قیمت -/38 روپے

کیمیا کی کہانی

مصنف: سید شہاب الدین دسنوی

انسان فطری طور پر تجسس پسند واقع ہوا ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے وغیرہ سوالات انسان کے ذہن میں ہمیشہ گونجتے رہے ہیں اور یہی سوالات مختلف ایجادات و انکشافات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔
''کیمیا کی کہانی'' میں بعض اہم عناصر مثلاً آکسیجن، بجلی، سوڈا، کیلشیم، میگنیشیم اور ریڈیم وغیرہ کی دریافت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

صفحات: 128، قیمت: -/16 روپے

اَسّی دن میں دنیا کا سفر

مصنف: جولیس ورن/مترجم: صفدر حسین

ایک بے حد دلچسپ ناول جس میں ایک اصول پسند اور اولوالعزم آدمی کی کہانی بیان کی گئی ہے جس نے اپنے دوستوں کے ساتھ شرط لگائی تھی کہ وہ اَسّی دن میں پوری دنیا کا سفر طے کرے گا۔ 20 ہزار پونڈ کی اس شرط کو جیتنے کے لیے اس نے اس سے کئی گنا زیادہ رقم خرچ کردی۔ لیکن کیا وہ شرط جیت سکا؟ یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات: 170، قیمت: -/21 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل

حیوانات ہماری رنگ برنگی دنیا کے حسن و دلفریبی میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں بھی معاون ہیں۔ زیر نظر کتاب میں بڑے دلچسپ انداز میں مختلف قسم کے حیوانات مثلاً ڈائنوسور، ہرن، بلی، مابئیڈر، جگنو، شیر اور چیتا وغیرہ سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ ایک بے حد دلچسپ کتاب جس کو بچوں کے ساتھ بڑے بھی پسند کریں گے۔

صفحات: 111، قیمت: -/17 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مصنف: سیّد محمد محسن
مترجم: محمد رضوان احمد خاں

ہماری مطبوعات

(''ابتدائی نفسیات'' سے اقتباس)

یادرکھنا اور بھولنا

یادآوری اور فراموشی

آپ نے جو کچھ اسکول کے دنوں میں سیکھا تھا اس سب کو یاد نہیں رکھتے۔ بہت سی چیزیں آپ فراموش کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر اس وقت تک علمِ ریاضی آپ کے مطالعے کا مضمون نہیں ہے تو آپ نے علمِ ہندسہ میں جو کچھ سیکھا تھا، شاید اس کا بہت کچھ حصہ آپ بھول چکے ہیں۔ لیکن آپ سب کچھ نہیں بھولے ہیں۔ بعض چیزیں آپ کو اب بھی یاد ہیں جو کچھ آپ یاد رکھتے ہیں اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ آپ کے حافظے میں جاگزیں ہے۔ جو کچھ آپ بھول گئے ہیں وہ آپ کے حافظے میں موجود نہیں ہے۔ قوت ماسکہ سیکھی ہوئی باتوں کو حافظہ میں موجود رکھتی ہے۔ ہم جو کچھ بھی سیکھتے ہیں وہ ہماری یادداشت میں اپنا اثر چھوڑ دیتا ہے۔ اس اثر کو نقش حافظہ کہا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ اثر مرکزی اعصابی نظام کی کوئی ترمیم ہو۔ جب ہم کچھ سیکھتے ہیں تو مرکزی اعصابی نظام میں ایک تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہی تبدیلی نقش حافظہ کی شکل میں قائم رہتی ہے۔ جب ہم سیکھی ہوئی باتوں کو دہراتے ہیں تو نقشِ حافظہ کا احیا ہو جاتا ہے۔ اس طرح جو کچھ ہمارے حافظے میں موجود ہے وہ نقشِ حافظہ کی صورت لی ہے۔ سیکھی ہوئی چیزوں کو بھول جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے نقشِ حافظہ کو قائم نہیں رکھتے۔ نقشِ حافظہ مٹ کر معدوم ہو چکا ہوتا ہے۔

بازیافت اور شناخت

جو کچھ ہم نے پہلے سیکھا یا تجربہ کیا، ان کی بازآوری یا بازیافت کی کوشش کر کے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ ہم حافظے میں کیا رکھ سکے ہیں اور کیا نہیں رکھ سکے۔ اس طرح بازیافت قوت ماسکہ کی آزمائش ہے۔ یادآوری اور فراموشی کے اختیارات میں آدمی کو پہلے کچھ سکھا دیا جاتا ہے۔ کچھ وقت گزر جانے کے بعد اسے ان سیکھی ہوئی باتوں کی بازیافت کے لیے کہا جاتا ہے۔ اگر وہ ان سب کی بازیافت کر لیتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ جو کچھ اس نے سیکھا اسے حافظے میں رکھ سکا ہے۔ اس کی یادداشت کامل ہے۔ اگر وہ سبھوں کی بجائے صرف ایک جزو کی بازیافت کر پاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس نے صرف اتنا ہی یاد رکھا، باقی بھول گیا۔ وہ انھیں حافظہ میں نہیں رکھ سکا۔ اس کی یادداشت نامکمل ہے۔ اس کی قوت ماسکہ کمزور کہی جائے گی۔

بازیافت قوت ماسکہ کی آزمائش ہے لیکن یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص سیکھی ہوئی باتوں کی بازیافت تو نہ کر سکتا ہو، لیکن ابھی تک وہ اس کے حافظے میں موجود ہوں، ان کا نقش حافظہ کمزور ہو۔ اگر وہ باتیں اس کے حافظے میں ابھی جاگزیں ہیں تو وہ ان کی شناخت کر سکتا ہے۔ اس طرح شناخت قوت ماسکہ کی دوسری آزمائش ہے۔ آپ نے انگریزی لفظ کو اپنی مادری زبان کے کسی لفظ کے قائم مقام کی حیثیت سے سیکھا ہوگا، کچھ دنوں کے بعد اگر آپ کو مادری زبان کا لفظ دیا جائے اور کہا جائے کہ اس کے لیے انگریزی لفظ کی بازیافت کیجیے تو اگر اس انگریزی لفظ کے لیے آپ کا ماسکہ کمزور ہے تو آپ اس کی بازیافت نہیں کر سکیں گے۔ لیکن اگر اسی لفظ کو بعض دوسرے الفاظ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے تو آپ اس کی شناخت اپنی مادری زبان کے لفظ کے قائم مقام کی طرح کر لیتے ہیں۔ اسی لفظ کی یادداشت آپ کے حافظے میں قائم ہے اور اسی لیے آپ نے اس انگریزی لفظ کی شناخت اپنی مادری زبان کے قائم مقام کی حیثیت سے کر لی اور اس طرح شناخت بازیافت کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ آدمی اس چیز کی شناخت کر سکتا ہے جس کی بازیافت وہ نہیں کر سکتا۔

جب بازیافت کی آزمائش کی جاتی ہے تو جس چیز کی بازیافت کرنی ہوتی ہے اسے اس شخص کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا۔ لیکن جب شناخت کی آزمائش کی جاتی ہے تو جو کچھ ماضی میں سیکھا گیا یا تجربے میں لایا گیا ہے اسے دوبارہ پیش کیا جاتا ہے اور وہ اس کی شناخت اس حیثیت سے کرتا ہے کہ پہلے اس

● اس کتاب میں اساسی حقائق اور نظریات کے پس منظر میں زندگی کی حقیقی صورتِ حال میں نفسیاتی علوم کے اطلاق کے اصول پر زور دیا گیا ہے تاکہ موضوع تعلیم کو روزمرّہ کی زندگی سے زیادہ قریب لایا جائے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذہانت اور رجحان کے ابواب بھی شامل کیے گئے ہیں جو طلبہ کو آگے چل کر اس موضوع کے مطالعے کے دوران آزمائش کی تعمیر کی تکنیکوں پر مکمل طور سے گفتگو کے لیے تیار کرتے ہیں۔ 240 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 61 روپیے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

نے اس کو سیکھا ہے یا ماضی میں اس کا تجربہ کیا ہے۔ بازیافت ماضی میں سیکھی یا تجربہ میں لائی ہوئی بات کی غیر موجودگی میں واقع ہوتی ہے۔ شناخت ماضی میں سیکھی یا تجربے میں لائی ہوئی بات کی موجودگی میں واقع ہوتی ہے۔ شناخت کسی جانی ہوئی چیز یا صورت حال کی واقفیت ہے۔ اگر اس چیز کی یادداشت جسے قبل سیکھایا جانا گیا ہے بالکل معدوم ہوچکی ہے تو شناخت ممکن نہیں ہوگی۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ نقشِ حافظہ ابھی حافظے میں موجود ہو۔ اگر نقشِ حافظہ بہت کمزور اور قوتِ ماسکہ ناقص ہو تو ہوسکتا ہے بازیافت ممکن نہ ہو۔ لیکن شناخت اس حالت میں بھی ممکن ہوسکتی ہے۔ اس طرح اگر قبل سیکھی ہوئی بات کی نہ تو بازیافت کی جاسکے اور نہ ہی اسے دوبارہ پیش کیے جانے پر جانی ہوئی چیز کی طرح شناخت کیا جاسکے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا ماسکہ کامل طور پر ختم ہوچکا ہے۔

بازآموزش

بازیافت اور شناخت کے علاوہ ماسکہ کی ایک دوسری آزمائش بھی ہے اسے بازآموزش کہتے ہیں۔ ایک شخص نے کچھ سیکھا تھا جس کی بازیافت وہ اس لمحے نہیں کرسکتا۔ وہ پھر اسے سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دیکھا جائے گا کہ وہ اسے کم سعی اور کم وقت میں سیکھ لے گا۔ جب ابتدا میں اس نے اسے سیکھا تھا تو اسے زیادہ سعی کرنی پڑی تھی یا زیادہ وقت صرف کرنا پڑا تھا۔ لیکن اس کی بازآموزی وہ زیادہ آسانی سے کرلے گا کیونکہ اس نے اسے مکمل طور سے فراموش نہیں کیا۔ نقشِ حافظہ موجود تھا مگر اتنا قوی نہ تھا کہ وہ اس کی بازیافت کرلیتا۔ اس لیے بازیافت ممکن نہ ہوسکی۔ لیکن بازآموزش زیادہ آسان ہوئی کیونکہ نقشِ حافظہ پوری طرح معدوم نہیں ہوا تھا۔ مثال کے طور پر آپ نے ادھر بہت برسوں سے اقلیدس نہیں پڑھی ہے، اور اقلیدس کی کسی خاص شکل کی بازیافت کی آپ کوشش کررہے ہیں۔ ممکن ہے آپ کامیاب نہ ہوں۔ لیکن جب آپ کتاب سے رجوع کرکے اس شکل کو دوبارہ سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ اس کو بہت آسانی سے اور جلد سیکھ لیتے ہیں۔ اگر آپ اسے مکمل طور سے فراموش کرگئے ہوتے تو اسے دوبارہ سیکھنے میں آپ کو اتنی ہی سعی اور وقت کی ضرورت پڑتی جتنی پہلی بار اسے سیکھنے میں پڑی تھی۔ دوسری مثال لیجیے۔ ایک شخص بے معنی ارکانِ تہجی کی ایک فہرست کو سیکھتا ہے تاکہ پوری فہرست کی وہ صحیح بازآوری کرسکے۔ فرض کیجیے ایسا کرنے میں اسے دس آزمائشوں کی ضرورت پڑی۔ ایک ہفتے بعد آپ اسے اس فہرست کی بازیافت کے لیے کہتے ہیں، بہت ممکن ہے وہ ایک رکن کی بھی صحیح بازآوری نہ کرسکے۔ اس کی بازیافت صفر ہے۔ آپ اسے وہ فہرست پھر سکھایئے۔ اگر آپ دیکھیں کہ وہ پوری فہرست کو چھ آزمائشوں میں سیکھ لیتا ہے تو اس مرتبہ اس نے چار آزمائشیں کم کیں۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ جو کچھ اس نے سیکھا تھا اسے مکمل طور سے فراموش نہیں کیا تھا۔ چونکہ اس فہرست کا نقشِ حافظہ کمزور ہوگیا تھا اسی لیے وہ ایک رکن کی بھی صحیح بازیافت نہیں کرسکا۔ بہرحال اسے کم آزمائشوں کی ضرورت پڑی اور چار آزمائشوں کی بچت ہوئی۔ نقشِ حافظہ بالکل معدوم نہیں ہوا تھا۔ اگر اسے بازآموزش کے لیے بھی دس آزمائشوں کی ضرورت پڑی تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے تھے کہ جو کچھ اس نے سیکھا اسے مکمل طور سے فراموش کرچکا تھا اور یہ بھی کہ اس کا ماسکہ بالکل باقی نہ تھا۔ اس طرح بازآموزش ماسکہ کی دوسری آزمائش ہے۔ اگر ماسکہ کمزور ہوتا ہے تو بازیافت ممکن نہیں ہوسکتی لیکن بازآموزش کم کوشش میں یا بغیر زیادہ مشق کے ممکن ہوسکتی ہے۔ وقت اور کوشش میں بچت ہوسکتی ہے۔ جب کوئی بچت نہیں ہوتی اور بازآموزش میں اتنی ہی کوشش اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے جتنی پہلے یا ابتدائی تعلم میں ہوئی تھی تو یہ نتیجہ نکالا، جاسکتا ہے کہ ماسکہ کی مکمل کمی ہے۔

فراموشی کا خطِ منحنی

فراموشی کی وجہ اس شے کا تلف ہوجانا ہے جو تعلم کے بعد حافظے میں رکھی جاتی ہے، ہم نے اسے نقشِ حافظہ کہا ہے۔ لیکن نقشِ حافظہ یکبارگی تلف نہیں ہوتا۔ یہ اتلاف تدریجی ہوتا ہے۔ اگر بیچ میں نقشِ حافظہ کے احیا کی کوشش نہیں کی جاتی تو وقت کے ساتھ وہ کمزور تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی لیے بازیافت اس وقت بہتر ہوتی ہے جب تعلم اور بازیافت کے درمیان تہجی کی کسی فہرست کو اس غرض سے سیکھتا ہے کہ یادداشت سے ہر رکن تہجی کی وہ صحیح صحیح بازآوری کرسکے۔ آپ اسے دو گھنٹے کے بعد اس فہرست کی بازیافت کے لیے کہیے۔ شاید وہ صرف ایک یا دو ارکان تہجی کی بازیافت میں ناکام ہوگا۔ وہی شخص دوسری فہرست کو سیکھتا ہے۔ اسے ایک دن کے بعد بازیافت کے لیے کہا جاتا ہے۔ وہ فہرست کے بہت سے ارکان تہجی کی بازیافت نہیں کرسکے گا۔ اسی طرح وہ ویسی ہی دوسری فہرستیں سیکھے اور ہر فہرست کی بازیافت کے لیے اسے اور زیادہ وقفے کے بعد کہا جائے مثلاً ایک فہرست ایک ہفتہ بعد، دوسری دو ہفتوں کے بعد اور تیسری ایک ماہ کے بعد۔ مختلف فہرستوں سے بازیافت کیے گئے ارکان تہجی کی تعداد کا موازنہ اگر آپ کریں گے تو دیکھیں گے کہ تعلم اور بازیافت کے درمیان طویل تر وقفے کے ساتھ بازیافت کم اور فراموشی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ فراموشی کی مقدار اور وقفے کی لمبائی کے درمیان تعلق کی وضاحت کے لیے فراموشی کا حسبِ ذیل خطِ منحنی تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یادآوری اور فراموشی میں وقت ایک اہم عامل (Factor) کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم ایک عام ضابطہ بناسکتے ہیں یعنی تجربہ جتنا پرانا ہوگا اس کی یاد اتنی ہی کمزور ہوگی۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ یہ ضابطہ ہر

حالت میں برقرار نہیں رہتا۔ یادآوری اور فراموشی کے اور دوسرے عوامل بھی ہیں۔

حافظے کا تعمیری فعل

فراموشی صرف بازیافت کی مقدار میں تدریجی کمی کے ذریعے ہی نہیں ظاہر کی جاتی بلکہ جس چیز کی بازیافت کی جاتی ہے اس کے مواد میں تبدیلی کے ذریعے بھی اسے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ کوئی شخص کسی افسانے کو کئی بار پڑھے۔ پھر جو کچھ اس نے پڑھا ہے اسے اپنی یادداشت کے سہارے لکھنے کی کوشش کرے۔ اگر اس نے کہانی کو اچھی طرح پڑھا ہے تو یادداشت کے سہارے لکھی ہوئی عبارت کہانی کے مواد کے مطابق ہوگی۔ کہانی میں موجود تمام واقعات وتصورات کی صحیح بازآوری اس کی تحریر میں ملے گی۔ دو ہفتوں کے بعد پھر اسے اپنی یادداشت سے اس کہانی کو لکھنے کے لیے کہا جائے۔ اس کے بعد اس کی تحریر کا موازنہ اصل کہانی سے کیا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ بعض واقعات وتصورات حذف ہوگئے کیونکہ وہ انھیں فراموش کرگیا تھا۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ بعض واقعات وتصورات کے بیان میں تبدیلی یا اضافہ ہوگیا ہے۔ اس طرح صرف یہی نہیں ہوتا کہ کہانی کی بازیافت اصل کہانی سے کم واقعات وتصورات کی حامل ہے۔ بلکہ اس میں بعض اصلی واقعات وتصورات کی جگہ نئے واقعات وتصورات بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ یادداشت میں ایسی ہی تبدیلی اس وقت بھی واقع ہوتی ہے جب آپ کسی شخص کے سامنے کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں اور سننے والا اسی واقعے کو کسی دوسرے شخص کے سامنے دہراتا ہے۔ سننے والے کا بیان محض واقعات وتصورات کی تعداد کے اعتبار سے ہی مختلف نہیں ہوتا بلکہ ان متفرق واقعات وتصورات کے اعتبار سے بھی جن میں سننے والے نے تبدیلی یا اضافہ کردیا ہو۔ وہ جان بوجھ کر ان میں تبدیلی یا اضافہ نہیں کرتا بلکہ ممکن ہے اسے اس بات کا یقین ہو کہ جو کچھ اس نے سنا تھا اسے اس نے صحیح طور سے بیان کردیا ہے۔ اس طرح فراموشی صرف بازیافت کی گئی باتوں کی مقدار یا تعداد میں تخفیف کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ سیکھی یا تجربے میں لائی ہوئی باتوں کی بازیافت کی کوشش کے وقت ان باتوں کے مواد یا کیفیت میں تبدیلی کے ذریعے بھی فراموشی کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ یادآوری صرف ماضی میں سیکھی یا تجربے میں لائی ہوئی باتوں کی صحیح بازیافت ہی نہیں ہے۔ حافظہ صرف عمل بازآوری نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک تعمیری یا تخلیقی عمل بھی ہے کیونکہ یادآوری بھی ماضی میں سیکھی یا تجربے میں لائی ہوئی باتوں کو بعض نئی باتوں میں بدل دینے یا ان میں کچھ نئی باتیں شامل کردینے کا عمل ہے۔

افواہوں کے پھیلنے میں حافظے کے تعمیری فعل کی وضاحت اچھی طرح ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، افواہیں عموماً غلط ہوتی ہیں۔ افواہ جو کچھ بتاتی ہے۔ وہ حقیقت نہیں ہوتی۔ لیکن افواہ زیادہ تر کسی حقیقت ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد حقیقت پر ہوتی ہے۔ مثلاً پولس ایک سرکش بھیڑ کو منتشر کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کرتی ہے جس کے نتیجے میں تقریباً ایک درجن اشخاص کو ہلکی چوٹ آجاتی ہے۔ ایک شخص یہ سب دیکھ رہا ہوتا ہے اور وہ اس واقعے کو دوسرے شخص سے جو وہاں پر موجود نہیں تھا، بیان کرتا ہے۔ سننے والا اس واقعے کو کسی تیسرے شخص سے جس سے اس کی ملاقات تھوڑی دیر کے بعد ہوتی ہے بیان کرتا ہے۔ وہ اس شخص کو بتاتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو سنگین چوٹیں آئیں اور چند ایک کی حالت نازک ہے۔ یہ تیسرا آدمی کسی چوتھے آدمی سے ملتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ سو سے زیادہ اشخاص کو نہایت سنگین زخم آئے ہیں اور کچھ تو اسپتال میں مرگئے۔ ایک منھ سے دوسرے منھ میں منتقل ہوکر تبدیل ہوتی ہوئی یہ افواہ پورے شہر میں پھیل سکتی ہے اور کسی اخبار کا نمائندہ بہت ممکن ہے کہ یہ رپورٹ شائع کرادے کہ پولس اور بھیڑ کے درمیان سنگین تصادم ہوا۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور بہتوں کو سنگین ضربیں آئیں۔

بھولنے کی وجوہات

وقت فراموشی کا ایک اہم عامل ہے۔ جو کچھ سیکھا یا تجربہ کیا جاتا ہے، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فراموش ہوجاتا ہے۔ لیکن وقت کے علاوہ فراموشی کی کئی دوسری وجہیں بھی ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ ہم کسی تجربے کی بازیافت ایک دوسرے تجربے کی دخل اندازی کے باعث نہ کرسکیں۔ ان جگہوں کے ناموں کی بازیافت میں کسی شخص کو کوئی دقت نہیں ہوتی جنھیں وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ فرض کیجیے حسب ذیل جگہوں کے نام آپ اچھی طرح جانتے ہیں:

لال پور، قیصر باغ، کشن گنج، پچھم دروازہ، بنیا پوکھر۔

جب آپ سے پوچھا جاتا ہے تو ہر ایک کے نام کی بازیافت آپ بہ آسانی کرسکتے ہیں۔ فرض کیجیے لال پور کے علاوہ حسب ذیل جگہوں کے نام بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں: لال باغ، لال گنج، لال دروازہ، لال پوکھر، ایک دوست سے گفتگو کرتے وقت آپ اسے لال پور کے متعلق کچھ بتانا چاہتے ہیں لیکن اس جگہ کے نام کی بازیافت میں آپ کو مشکل ہوسکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسے بھول گئے ہیں لیکن آپ یقین کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ وہ آپ کو اچھی طرح یاد ہے، یا ہوسکتا ہے آپ غلط طور پر مندرجہ بالا جگہوں میں سے کسی ایک کے نام کی بازیافت کریں، اور یہ بھی جانتے ہوں کہ آپ کی یادداشت صحیح نہیں ہے۔ صحیح نام کی بازیافت میں ناکامی ناموں کے گڈمڈ ہوجانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بعد میں ہوسکتا ہے کہ آپ صحیح نام کی بازیافت کرلیں اس لیے بعض اوقات یہ ممکن ہے کہ کسی چیز یا واقعہ کو یاد

رکھنے پر بھی اس کی صحیح بازیافت نہ ہوسکے۔ بازیافت کے وقت ہوسکتا ہے کہ حافظہ کے ایک سے زیادہ نقوش کا احیا ہوجائے اور اس طرح الجھن پیدا ہوجائے جس کی وجہ سے ایک شخص بازیافت کی کوشش میں ناکام رہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ بعض فراموشیاں اس امر کے باعث ہوتی ہیں کہ جو کچھ باتیں ایک وقت میں سیکھتے یا تجربہ کرتے ہیں، وہ قبل کی سیکھی ہوئی باتوں میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح بعض اوقات وہ باتیں جنھیں ہم سیکھ چکے ہوتے ہیں ان باتوں کی یادداشت کے ساتھ جنھیں ہم بعد میں سیکھتے ہیں دخل اندازی کرتی ہیں۔

"دخل اندازی سے پیداشدہ یادداشت میں کمی کی وضاحت دوسرے طریقے سے بھی کی جاسکتی ہے۔ فرض کیجیے بے معنی الفاظ کی ایک فہرست کو یاد کرنے کے بعد آپ ایک گھنٹہ ٹیبل ٹینس کھیلنے لگیں، اس کے بعد آپ اس فہرست کی بازیافت کریں۔ دوسرے دن آپ بے معنی الفاظ کی دوسری فہرست کو یاد کرکے ایک گھنٹہ سوجائیں اور جب آپ جاگیں تو اس فہرست کی بازیافت کی کوشش کریں۔ تیسرے دن بے معنی الفاظ کی ایک اور فہرست کو یاد کریں اور اس کے بعد آپ ایک تازہ فہرست کو ایک گھنٹہ تک یاد کرتے رہیں۔ جس کے بعد پہلی فہرست کی بازیافت کی کوشش کریں۔ جب آپ ان الفاظ کی تعداد کا موازنہ کریں گے جن کی بازیافت آپ ان تین دنوں میں کرسکے تو اغلباً آپ پائیں گے کہ آپ نے سب سے زیادہ تعداد میں اس روز بازیافت کی جس دن آپ تعلم کے بعد سوئے تھے۔ دوسری صحیح طور سے بازیافت شدہ تعداد اس دن کی ہوگی جس دن آپ نے ٹیبل ٹینس کھیلا تھا۔ صحیح بازیافت کی سب سے کم تعداد تیسرے دن ہوگی۔ آپ جب سونے گئے تو آپ کوئی ایسا تجربہ نہیں کررہے تھے جو اس کی یادداشت میں دخل انداز ہوسکتا جو آپ نے سیکھا تھا۔ آپ نے جب ایک فہرست کو سیکھنے کے بعد ایک دوسری اسی جیسی فہرست کو سیکھا تو دخل اندازی زیادہ سے زیادہ تھی۔ ان دو فہرستوں کی یادداشت آپس میں خلط ملط ہوگئی، چنانچہ بازیافت میں زیادہ غلطیاں ہوئیں۔ آپ نے جب ٹیبل ٹینس کھیلا تو دخل اندازی کم ہوئی۔ کیونکہ آپ کا یہ فعل بے معنی الفاظ کو یاد کرنے سے بالکل مختلف تھا۔

اوپر کی مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مماثل تجربات جب ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں تو غیر مماثل تجربوں کی بہ نسبت زیادہ دخل اندازی پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے نئے تجربات پرانے تجربوں سے عموماً زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ اس لیے فراموشی صرف وقت کی اس طوالت سے پیدا نہیں کرتے۔ ہمارے بہت سارے مشاہدات اور افعال ایسے بھی ہوا کرتے ہیں جو ہمارے اندر کوئی احساس پیدا نہیں کرتے۔ عام طور سے ہم انھیں یاد نہیں رکھتے۔ سڑک پر ایک شخص کی ملاقات کسی ایسے آدمی سے ہوتی ہے جس سے وہ اکثر ملا کرتا ہے، ممکن ہے وہ اس سے باتیں بھی کرے۔ تھوڑی دیر بعد ہوسکتا ہے وہ اس کی ملاقات کو یا جو گفتگو اس سے ہوئی، فراموش کردے۔ لیکن اگر کوئی کسی شخص سے ایک طویل عرصے کے بعد ملتا ہے اور اس ملاقات سے وہ خوشی محسوس کرتا ہے تو اغلباً وہ اس ملاقات کو یاد رکھے گا۔ ٹھیک اسی طرح اگر کسی کی ملاقات سڑک پر ایک ایسے شخص سے ہوجاتی ہے جو اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا شروع کردیتا ہے تب بھی بہ قرینہ اغلب وہ اسی ملاقات کو یاد رکھے گا۔ اگر کوئی شخص اپنے بچپن کے تجربوں کی بازیافت کی کوشش کرے تو وہ دیکھے گا کہ اس کے بازیافت شدہ (Recalled) تجربے زیادہ تر تو وہ ہیں جن سے اس نے خوشی حاصل کی تھی۔ یا وہ جو اس کے لیے تکلیف اور مصیبت کا باعث بنے تھے۔

یادداشت کو جذبات ایک اور طریقے سے متاثر کرتے ہیں۔ اگر آپ جذباتی طور پر پریشان ہیں تو آپ کی یادداشت ناکام ہونے لگتی ہے۔ اگر کوئی طالب علم اپنے استاد سے بہت زیادہ خائف ہو تو ایسے میں وہ استاد کے سامنے اس چیز کی بازیافت نہیں کرسکتا۔ جو اسے اچھی طرح یاد ہے۔ معلم کا خوف اس کی یادداشت میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ ایک طالب علم اسکول کی کسی تقریب میں پڑھنے کے لیے ایک نظم اچھی طرح ازبر کرلیتا ہے۔ لیکن جب وہ اسے سنانے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی یادداشت ناکام ہوجاتی ہے، وہ سامعین کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پاکر گھبرا جاتا ہے۔ وہ جذباتی طور پر پریشانی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی طالب علم کو امتحان کا خوف ہوتا ہے تو وہ امتحان میں گھبراہٹ کی وجہ سے نہایت اچھی طرح یاد کی ہوئی باتوں کو بھی بھول جاتا ہے۔

کسی شخص کے لیے ایک شدید جذباتی صدمہ بعض اوقات اس کی گزشتہ زندگی کی تمام باتوں کی فراموشی کا سبب بن جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سنگین حادثے کا شکار ہوکر بغیر کسی جسمانی چوٹ کے کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہوجائے تو کبھی کبھی وہ ہوش میں آنے کے بعد اس حادثے کے متعلق سب بھول جائے گا۔ بعض اوقات وہ اپنا نام، پتہ اور اپنے رشتے داروں کو بھی بھول سکتا ہے۔ ایسی حالتوں میں درحقیقت یادداشت کھو نہیں جاتی بلکہ وہ لاشعوری ہوجاتی ہے۔ اس کا احیا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر یادداشت کا احیا ہوجائے تو وہ پھر ذہنی صدمے اور جذباتی اضطراب کا باعث ہوگا۔ ان حالتوں میں فراموشی ایک مقصد کی تکمیل کرتی ہے۔ یہ صدمے کی تکرار کو روکتی ہے، اس وجہ سے بعض ماہرین نفسیات فراموشی کو فعال عمل کہتے ہیں۔ بعض تجربات اس لیے فراموش نہیں ہوتے کہ وقت کے ساتھ وہ زائل ہوجاتے ہیں یا دوسری یادیں ان کی بازیافت میں خلل انداز ہوتی ہیں، بلکہ اس لیے فراموش ہوجاتے ہیں

کہ ان کا احیا ذہنی صدمے کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ان کا احیا کیا جائے تو اس سے جذباتی طور پر پریشانی پیدا ہوگی اور آدمی اپنے معمولی فرائض پر توجہ دینے سے معذور ہوگا۔ جذباتی حالت میں کوئی شخص اس طرح کام نہیں کرسکتا جس طرح اسے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کرنا چاہیے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی کے مناسب حال مطابقت کا وہ اہل نہیں رہتا۔

فراموشی کی فعال نوعیت عارضی فراموشی کی بعض حالتوں میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ممکن ہے آپ کو کسی ایسے شخص کی طرف سے کھانے کی دعوت ملے جسے آپ حقیقت میں پسند نہیں کرتے اور چونکہ آپ ظاہری طور پر اس کے لیے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں اسی لیے دعوت میں جانے کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔ لیکن آپ دعوت کی تاریخ بھول جاتے ہیں اور اس طرح شرکت نہ کرنے کا ایک اچھا بہانہ مل جاتا ہے۔ یہ فراموشی آپ کو متحیر کرتی ہے کیونکہ دعوت ختم ہونے کے بعد آپ کو تاریخ یاد آجاتی ہے۔ فراموشی نے دعوت میں نہ جانے کی آپ کی حقیقی خواہش کو پورا کردیا۔ اس سے آپ کے مقصد کی تکمیل ہوگئی۔ بعض اوقات کسی ایسے دوست سے جس کی صحبت آپ کو عزیز ہے، ملاقات ہوتے وقت آپ اس سے جلد علاحدہ ہونا نہیں چاہتے۔ لیکن کسی اہم کام کی خاطر آپ کو رخصت ہونے کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی چھتری ساتھ لینا بھول جاتے ہیں جس کے لیے کام ختم کرکے اس کے پاس واپس آتے ہیں۔ فراموشی اس سے پھر ملاقات کرنے کا موقعہ بہم پہنچادیتی ہے۔

ہم جو کچھ یاد رکھتے یا بھولتے ہیں اس کا سبب ہماری ذاتی ضروریات بھی ہوتی ہیں۔ جو طالب علم صرف امتحان میں کامیاب ہونا چاہتا ہے، وہ درسی کتابوں کو پڑھتا ہے اور ان میں بیان کردہ اور صراحت کردہ امور اور تصورات کو اخذ کرتا ہے۔ وہ انھیں یاد رکھتا ہے اور ان سے متعلق سوالوں کا امتحان میں جواب دیتا ہے۔ لیکن امتحان کے فوراً بعد اس نے جو کچھ سیکھا تھا اسے بھول جاتا ہے۔ انھیں مزید یاد رکھنے کی اسے ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسرا طالب علم اپنی درسی کتابیں نئے واقعات و تصورات کو سیکھنے کے لیے پڑھتا ہے۔ اس کا مطالعہ اور تعلم علم کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ وہ بھی پہلے طالب علم کی طرح امتحان دیتا ہے لیکن امتحان کے فوراً بعد ہی وہ ان باتوں کو بھلا نہیں دیتا بلکہ بہت سی باتیں، اسے بہت دنوں تک یاد رہتی ہیں۔ ڈاکٹر کو دواؤں کے نام یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ اسے ان دواؤں کو اپنے مریضوں کے لیے تجویز کرنا ہوتا ہے۔ آپ اسے کسی نئی دوا کا نام بتایئے اور ساتھ ہی کسی نئی جگہ کا بھی۔ کئی دنوں کے بعد ان دونوں ناموں کے لیے اس کی یادداشت کی آزمائش کیجیے۔ وہ دوا کے نام کی بازیافت کرلے گا لیکن بہت ممکن ہے کہ جگہ کا نام فراموش کردے۔

یاد رکھنے اور بھولنے پر دل چسپیوں کی اثراندازی بھی ہوتی ہے۔ دلچسپیاں ضروریات سے متعلق ہوتی ہیں۔ عام طور پر آدمی ان چیزوں، شخصوں اور افعال میں دل چسپی رکھتا ہے جو اس کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ اسے ان امور (Matters) سے دل چسپی نہیں ہوتی جس کا اس کی ضرورتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک ڈاکٹر کو اپنی اور اپنے خاندان کی معاشی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کمانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی وہ ایک اچھے ڈاکٹر کی حیثیت سے مشہور ہونے کی تمنا بھی رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض ڈاکٹروں کے لیے دوسروں کا علاج اور ان کی تکلیفیں دور کرنے میں ان کی مدد کرنا ایک اہم ضرورت بن جاتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ڈاکٹر دواؤں کے نام اور ان کے اثرات سے واقف ہو۔ دواؤں کے متعلق جاننے میں اسے فطری طور پر دل چسپی ہوجاتی ہے جو انھیں یاد رکھنے کا سبب بن جاتی ہے۔ ایک سماجی کارکن اشخاص اور مقامات کے ناموں میں دل چسپی رکھتا ہے۔ مختلف حالات اور مختلف مقامات میں لوگوں کی خدمت کی ضرورت اس کے اندر ان تمام امور سے دل چسپی پیدا کردیتی ہے جس کا اس کی اس ضرورت سے تعلق ہے۔ اشخاص اور مقامات کے ناموں کے لیے اس کی یادداشت بہتر ہوسکتی ہے۔ دواؤں کے ناموں کے لیے اس کی یادداشت کمزور ہوگی۔

کسی چیز کو اچھی طرح یاد رکھنے کے لیے اس سے دل چسپی پیدا کرنی چاہیے۔ ہر قسم کی چیزوں کے لیے اچھی یادداشت رکھتا ہے جس سے اسے گہری دل چسپی ہوتی ہے۔ اگر کوئی طالب علم تواریخ سے دل چسپی رکھتا ہے تو تاریخوں اور واقعات کے لیے اس کی یادداشت اچھی ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر وہ تواریخ کا مطالعہ بغیر دل چسپی کے کرتا ہے تو واقعات اور تاریخوں کے لیے اس کی یادداشت کمزور ہوگی۔ کسی موضوع کے لیے اپنی یادداشت کو بہتر بنانا ہو تو اس موضوع میں دل چسپی پیدا کرنا ضروری ہے۔ ایک اچھا معلم اپنے موضوع کو دل چسپ بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس کے شاگرد اس کے بتائے ہوئے سبق کو یاد کرنے کے بہتر اہل ہوتے ہیں۔ ایک ادنا معلم دل چسپی پیدا نہیں کرسکتا۔ اس کے شاگرد اس کی بتائی ہوئی باتوں کو جلد فراموش کردیتے ہیں۔

دماغ پر شدید ضرب بھی فراموشی کا باعث ہوجاتا ہے۔ جب آپ کوئی چیز سیکھتے ہیں تو اس کے سبب سے مرکزی نظامِ عصبی میں ایک تغیر پیدا ہوجاتا ہے۔ اس تغیر کو ہم نے ''نقشِ حافظہ'' کہا ہے۔ جب دماغ کے کسی بھی حصے کو نقصان پہنچتا ہے تو نقشِ حافظہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس لیے دماغ کی چوٹ یادداشت میں قابلِ غور نقصان پیدا کرسکتی ہے۔

□□□

مصنف: ایچ. این. سنہا
مترجم: ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی

ہماری مطبوعات ("ہندستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا" سے اقتباس)

ہند اسلامی سیاسی نظام — ایک تعارف

ہندستان میں مسلمانوں کی آمد کا آغاز 712 میں سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے کے ساتھ ہوا تھا۔ کچھ عرب تاجروں کو ہندستانی ڈاکوؤں نے ہندستان کے مغربی ساحل پر لوٹ لیا تھا اور اس کے لیے بغداد کے خلیفہ نے سندھ کے راجہ کو ذمّے دار ٹھہرایا تھا کیونکہ راجہ نے نہ تو ڈاکوؤں کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تھا اور نہ ہی عرب تاجروں کو ہرجانہ ادا کیا تھا۔ اس لیے محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک فوج بھیجی گئی۔ یہ فوجی مہم کامیاب رہی اور اس کے نتیجے میں سندھ کی چھوٹی سی ریاست خلیفہ کی وسیع و عریض سلطنت کا حصہ بن گئی۔ سندھ پر عربوں کی حکومت تقریباً ڈیڑھ سو برس تک قائم رہی۔ بغداد کی خلافت کمزور ہوجانے کے بعد سندھ پر عربوں کا کنٹرول کم ہوتا گیا اور بالآخر وہ بالکل ہی ختم ہوگیا۔ اسی دوران وسطی ایشیا کے ترکوں نے اسلام قبول کرکے خلافت میں اثر ورسوخ حاصل کرلیا تھا۔ انھوں نے وسطی ایشیا میں ہندستان اور افغانستان کی سرحدوں کے نزدیک کچھ آزادانہ ریاستیں قائم کرلی تھیں۔ انھوں نے اس کے ہندو حکمرانوں سے افغانستان کو چھین کر اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ اس سے ان کے لیے ہندستان پر فوج کشی کرنے کے لیے راہ ہموار ہوگئی تھی۔ ایسا دسویں صدی میں ہوا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب شمالی ہندستان کا سیاسی شیرازہ منتشر ہورہا تھا۔ 647 میں ہرش وردھن کی موت کے بعد اس کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی تھی۔ پنجاب سے لے کر آسام تک اور ہمالیہ سے وندھیاچل کے درمیان متعدد چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوگئی تھیں۔ ان کی آپسی لڑائیوں نے ان کو کمزور کردیا تھا۔ مسلمان ترکوں نے اس صورت حال کا پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے پنجاب پر کئی حملے کیے۔ محمود غزنوی نے گیارھویں صدی کی پہلی چوتھائی میں پنجاب سے آگے بڑھ کر مشرق میں بنارس تک اور جنوب میں گجرات تک فوج کشی کی۔ اس نے شمالی ہندستان کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس کے انتقال کے وقت مسلمانوں کی حکومت پنجاب میں قائم ہوچکی تھی۔ اس کی موت کے ڈیڑھ سو برس بعد تک مسلمانوں کی حکومت صرف پنجاب تک ہی محدود تھی۔ بارھویں صدی کے آخر میں ایک نئے حملہ آور محمد غوری نے دہلی اور اجمیر پر حملہ کرکے گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اس کے جنرل قطب الدین نے اس کی فتوحات کو اور آگے بڑھایا اور ہندستان میں پہلی مسلمان سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کو دہلی سلطنت کہا جاتا ہے۔

دہلی کے بادشاہوں کو شمالی ہندستان پر قبضہ کرنے اور اس پر اپنا تسلط جمانے میں تقریباً سو برس صرف ہوئے۔ جنوب پر قبضہ سولھویں صدی کے پہلے نصف میں ہوا لیکن جنوب پر دہلی سلطنت کی حکومت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہی۔ کچھ عرصے بعد یہ دوبارہ آزاد ہوگیا تھا۔ وہاں دو بڑی اور طاقتور سلطنتیں ابھریں۔ ان میں سے ایک ہندوؤں کی تھی اور دوسری مسلمانوں کی۔ جنوب کی دو صدیوں کی تاریخ ان کی آپسی لڑائیوں سے پر ہے۔ سولھویں صدی کے آخر میں دہلی سلطنت کا زوال ہوگیا۔ اس کی وجہ اندرونی کمزوریاں اور مغلوں کے حملے تھے۔

دہلی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہونے کے بعد شمالی ہندستان میں نئی سلطنتیں قائم ہوئیں اور سیاسی اتحاد پارہ پارہ ہوکر رہ گیا۔ شمالی ہندستان کی کم وبیش وہی حالت ہوگئی جو پانچ سو برس قبل محمود غزنوی کے حملے کے وقت تھی۔ اس سے مغل حملہ آوروں کا کام آسان ہوگیا۔ افغانستان کے بادشاہ بابر نے 1526 میں دہلی کے افغان حکمراں ابراہیم لودی کو اور 1527 میں راجپوتانہ کے حکمراں رانا سنگرام سنگھ کو شکست دی۔ بابر ایشیا کے دو عظیم فاتحوں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ ماں کی طرف سے وہ چنگیز خاں کی اولاد میں تھا اور باپ کی طرف سے اس کا سلسلہ تیمور سے ملتا تھا۔ افغانوں اور راجپوتوں پر فتح پانے کے بعد ہندستان میں مغل سلطنت کی بنیاد پڑ گئی۔ اس خاندان سے تعلق رکھنے والے نامور شہنشاہوں نے تقریباً دو سو برس تک اس ملک پر حکومت کی۔ انھوں نے پورے ہندستان کو سیاسی طور پر اس طرح متحد کردیا تھا جس کی مثال موریہ

● یوں تو ہندستانی سیاسی نظام کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ایسی کوئی کتاب موجود نہیں ہے جس میں ہندستانی تاریخ کے آغاز سے موجودہ دور تک کے سیاسی اداروں، نظریوں اور روایتوں کا جائزہ لیا گیا ہو۔ یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ اس کے پہلے حصے میں قدیم ہندستان میں ریاست کے ارتقا اور دوسرے حصے میں قرونِ وسطیٰ کے ہندستان میں ریاست کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کتاب میں ہندستانی سیاسی روایات اور اداروں کے تسلسل اور ان کی نشوونما کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ 377 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 95 روپیے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر 40فیصد خصوصی رعایت دیتی ہے۔

اور گپت دور کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ اکبر اعظم نے ایک ایسی عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی جس میں افغانستان کشمیر اور تمام ہند۔گنگا کا میدان شامل تھا۔ یہ سلطنت شمال میں ہمالیہ، جنوب میں وندھیاچل، مشرق میں خلیج بنگال اور مغرب میں بحر عرب سے گھری ہوئی تھی۔ اس نے ایک ایسا انتظامی نظام قائم کیا تھا اور ایک ایسا سیاسی اعتماد قائم کیا تھا جو اس کی موت کے بعد بھی عرصہ تک قائم رہا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مغلوں کے زوال کے بعد بھی یہ انتظامی نظام بدستور قائم رہا۔ مرہٹوں نے اور ان کے بعد انگریزوں نے اپنے انتظامی نظام میں اس کو استعمال کیا۔ اس سے مغلوں کے کام کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن مغل حکومت دراصل اسی نظام کی ترقی یافتہ شکل تھی جو ابتدائی مسلم حکمرانوں یعنی محمود غزنوی اور قطب الدین ایبک نے قائم کیا تھا۔ اس مطالعے میں اس کا ہند۔اسلامی نظام حکومت کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔

مسلمانوں نے ہندستان میں جو سیاسی نظام قائم کیا اس کو ہند۔اسلامی نظام حکومت اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کا سرچشمہ اور اس کے اجزائے ترکیبی کچھ اس قسم کے تھے کہ اس میں ایسے سیاسی آدرش روایات اور ادارے یکجا ہوگئے تھے جن کا تعلق اگر ایک طرف ہندستان کی قدیم تاریخ سے تھا تو دوسری طرف اس میں ایسے اجزا بھی شامل تھے جو مسلمان اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور جن کو انھوں نے اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد اس ملک میں رائج کیا تھا۔ یہ آمیزش آہستہ آہستہ چھ صدیوں تک پھیلتی رہی۔ اس کی ابتدا 1000 میں محمود غزنوی کے دور میں ہوئی تھی اور اکبر کے دور کے خاتمے یعنی 1600 تک یہ اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

مسلمان اپنے ساتھ کچھ سیاسی تصورات اور ادارے لے کر آئے تھے جن کا جنم اور نشوونما عرب اور ایران میں ہوا تھا۔ ابتدائی اسلامی ریاست جس کو پیغمبر اسلام نے قائم کیا تھا اور جو بعد میں خلفائے راشدین، بنوامیہ اور عباسیوں کے دور میں کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں پائی جاتی تھی، ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کے لیے ایک نمونہ یا ماڈل کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کا انتظامی ڈھانچہ ان ہی خطوط پر مبنی تھا جس پر خلافت قائم تھی۔ ان کا قانونی نظام وہی تھا جو عرب میں پہلے تو پیغمبر اسلام کی تعلیمات اور فیصلوں کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور بعد میں جس کی تشریح اور تعبیر فقیہ اور قانون دانوں مثلاً ابوحنیفہ وغیرہ نے کی تھی۔ ان کا مالی نظام بھی خلافت کے طرز پر تھا لیکن یہ ادارے ہندستان کے انتظامی ڈھانچے میں بغیر تبدیلیوں کے رائج نہیں کیے جاسکتے تھے۔ مسلمان حکمرانوں کے لیے ہندستان کا ماحول خلافت کے ماحول سے بہت مختلف تھا یہاں غیر مسلموں کی بڑی تعداد کی موجودگی نے جن کا عقیدہ، فلسفہ، تمدن اور سیاسی ادارے مختلف تھے اور جو اپنا عقیدہ تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں تھے مسلمان حکمرانوں کے لیے شدید مشکل مسائل پیدا کردیے تھے۔ اس کے علاوہ وہ مسلمان جو پہلے سے اس ملک میں بس گئے تھے، اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ رہتے رہتے اس ملک کے باشندے بن گئے تھے، آپسی میل جول کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے نزدیک آگئے تھے۔ اس کے نتیجے میں مسلم حکمرانوں نے رواداری کی پالیسی اپنائی تھی اور ہندو رعایا کے ساتھ بہتر برتاؤ کیا تھا۔ دہلی سلطنت کے زوال اور مغلیہ سلطنت کے عروج کے درمیانی عرصے میں ہندستان بھر میں چھوٹی چھوٹی علاقائی سلطنتیں قائم ہوگئی تھیں جہاں ہندو راجہ مسلمان رعایا پر اور مسلمان بادشاہ ہندو رعایا پر حکمرانی کررہے تھے۔ مسلمان حکمرانوں کے لیے اپنی حکومت کی بقا اور تحفظ کے لیے ایک غیر فرقہ وارانہ رویہ اپنانا ضروری ہوگیا تھا۔ اس کے لیے باہمی سمجھوتے کی ضرورت تھی۔ اس کے نتیجے میں زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک آمیزش پیدا ہوئی تھی جس کا اظہار زبان، ادب، آرٹ، فن تعمیر، مذہب لباس اور طرز زندگی میں ہوا تھا۔ ہندستان میں مسلم دورِ حکومت میں اس آمیزش کا اظہار کیوں کر ممکن ہوا تھا؟ اور ہندستانی سیاسی روایات اور ادارے ایک اجنبی اور اسلامی طرز حکومت سے کس طرح ہم آہنگ ہوئے تھے؟ ان سوالات کے جواب کے لیے اسلام سے قبل اس ملک کے سیاسی ارتقا اور اس ملک میں پہلے سے پائے جانے والے سیاسی اداروں اور روایات کا جائزہ لینا ضروری ہوجاتا ہے۔

قدیم ہندستان میں ریاست ایک طویل ارتقائی دور سے گزری تھی۔ اس کی جڑیں پندرہ سو قبل مسیح یعنی ویدک دور میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ ویدک سیاسی نظام میں قبائلی بادشاہت رائج تھی۔ اس کو راشٹر کہا جاتا تھا۔ اس سے مراد وہ خطۂ زمین تھا جس پر بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ بادشاہ کا اکثر انتخاب ہوتا تھا۔ اس کو قبائلی لیڈروں کی اکثریت کی رائے سے معزول بھی کیا جاسکتا تھا۔ یہ لیڈر ایک اسمبلی میں جمع ہوتے تھے دو مجلسیں ہوتی تھیں۔ ایک کو سبھا کہا جاتا تھا جو ممتاز اور سرکردہ افراد پر مشتمل کونسل ہوتی تھی۔ دوسری مجلس کا نام 'سمیتی' یا مجلس عام ہوتا تھا۔ سلطنتیں چھوٹی اور منظم ہوتی تھیں۔ ان میں اضلاع اور گاؤں شامل ہوتے تھے۔ ان کے رقبے مختلف ہوتے تھے۔ بادشاہ کو عوام اپنی مرضی سے نذرانے پیش کرتے تھے۔ یہ بادشاہ کی آمدنی کا ذریعہ تھا اور اس سے وہ اپنا وقار قائم رکھتا تھا۔ وہ جنگ میں لوگوں کا لیڈر ہوتا تھا۔ بادشاہ کی اہمیت جنگ کے دوران لیڈر کی اور امن کے دوران محافظ کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ اس سے اس کی سماجی حیثیت اور اختیارات میں زبردست اضافہ ہوگیا تھا۔ ہندستان میں آریوں کی آمد سے پہلے ایسا نہیں تھا۔ جلد ہی بادشاہت کا ادارہ اہم ترین سماجی ادارہ بن گیا تھا۔ اس کا کردار سیکولر تھا۔

ریاست یا راشٹر کی اکائی گاؤں یا گرام تھا۔ اس کی اپنی ایک سبھا ہوتی

تھی۔ یہ گاؤں کی مشترکہ زندگی کا مرکز ہوتی تھی۔ یہاں لوگ جمع ہوکر روزمرہ کے مسائل کے بارے میں بحث کرتے تھے، اپنے کاموں کو منظم کرتے تھے اور جائداد وغیرہ کے جھگڑے نپٹاتے تھے۔ سبھا گاؤں کی خودمختاری کی علامت تھی۔ یہ ہند آریائی سیاسی نظام کی امتیازی خصوصیت تھی۔ گاؤں کا سربراہ گرامی کہلاتا تھا۔ اس کے پاس کسی قسم کے اختیارات نہیں ہوتے تھے۔ وہ اس قسم کا ظالم حکمراں نہیں ہوتا تھا جیسا کہ وہ بعد میں برطانوی دور میں بن گیا تھا۔ جنگ کے درمیان وہ گاؤں کی رضاکارانہ فوج کی لیڈر ہوتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو بادشاہ کا انتخاب کرتے تھے۔

ویدک سیاسی نظام یا ہند آریائی نظام میں اس وقت تبدیلی آئی جب آریوں کی حکومت پھیلی اور انھوں نے پورے ہند۔گنگا کے میدان پر قبضہ کرلیا۔ اس دور میں جو برہمن دور کہلاتا ہے، قدیم ہندستان کی ریاست کی شکل اور اس کے کاموں میں اہم اور دوررس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایک بات تو یہ ہوئی کہ چھوٹے ویدک راشٹر پھیل کر بہت بڑے ہوگئے۔ ان کی حکومتیں زیادہ طاقتور ہوگئیں۔ بادشاہت منتخبہ ہونے کے بجائے موروثی بن گئی۔ سبھا اور سمیتی کی حیثیت میں فرق آگیا۔ اب وہ مشاورتی ادارے بن گئیں۔ ان کی اہمیت گھٹ گئی۔ ان کی جگہ نئے اداروں نے لے لی جو بادشاہ کے افسران ہوتے تھے۔ ان کو رتنن کہا جاتا تھا۔ یہ بادشاہ کی اس کے کاموں میں مدد کرتے تھے۔ وہ شاہی حکومت کے مختلف شعبوں کے انچارج ہوتے تھے۔ اس کا اظہار ان کے عہدوں سے ہوتا ہے۔ رتنن آگے چل کر بادشاہ کے وزیر بن گئے تھے۔ گاؤں کو خودمختاری حاصل تھی۔ اس خودمختاری کا اظہار سبھا کے ذریعے ہوتا تھا۔ متعدد ریاستوں کا وجود میں آنا شاہی اختیارات میں اضافہ، موروثی بادشاہت اور ایک ایسی انتظامیہ کا قائم ہونا جس میں ریاست کے اعلا ترین افسر شامل ہوتے تھے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ برہمنی دور میں ویدک سیاسی نظام نے کس قسم کی ترقی کی تھی۔ اس کے علاوہ بادشاہت کے بارے میں ایک ایسے نظریے نے جنم لیا تھا جو ہابس کے سماجی معاہدے کے نظریے سے ملتا جلتا تھا اور جس کو ہابس نے پانچ سو برس بعد پیش کیا تھا۔ بادشاہ کے عہدے کو تقدس حاصل ہوگیا تھا۔ اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے پر بادشاہ کو معزول بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس دور میں بحیثیت ایک ادارہ کے بادشاہت کو ایک فلسفیانہ بنیاد، تقدس اور مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔

بادشاہت کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں جمہوری ریاستیں بھی قائم ہوگئی تھیں۔ یہ قبائلی جمہوریتیں یا گن راشٹر ہمالیہ کے شمالی علاقوں، گنگا کے میدان کے شمالی حصوں اور سندھ کے میدانوں میں قائم تھیں۔ ان ہی جمہوریتوں میں سے ایک میں مہاتما بدھ کا جنم ہوا تھا۔ یہ ریاستیں اپنے قبائلی ناموں سے مشہور تھیں۔ یہ بہت چھوٹی چھوٹی سلطنتیں تھیں۔ ان کے اجلاس اسمبلی ہال میں ہوتے تھے۔ اس میں قبیلے کے سبھی بالغ افراد اکٹھا ہوکر اپنے مسائل طے کرتے تھے۔ وہ مختلف افسروں کا بھی انتخاب کرتے تھے۔ ان افسروں کا ایک بورڈ ہوتا تھا جو قبیلے کی حکومت چلاتا تھا۔ یہ قبائلی جمہوریتیں سیاسی طور پر نہایت بیدار، منظم اور جنگجو تھیں۔ یہ تھا برہمنی دور میں سیاسی نظام کا ارتقا۔

اس کے بعد یعنی سات سو سے دو سال قبل مسیح میں ایک نیا سیاسی نظام ابھرا۔ یہ شہنشاہیت یا وسیع سلطنت کا آدرش تھا۔ اس کا مطلب تمام متحد ہندستان پر ایک بادشاہ کی حکومت تھی۔ اس آدرش کو حاصل کرنے کے لیے دنیا پر فتوحات حاصل کرنے اور چکرورتی یا سمراٹ یا شہنشاہ کا لقب حاصل کرنا ضروری تھا۔ یہ آدرش طاقتور شاہی ریاستوں کے درمیان طویل باہمی جنگوں کا نتیجہ تھا۔ سکندر اعظم کے حملے نے اس کے لیے راہ ہموار کردی تھی۔ سکندر پنجاب سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا، کیوں کہ کچھ قبائلی جمہوری سلطنتوں نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ ہندستانی بادشاہوں نے سکندر کی مثال سامنے رکھی اور چندرگپت موریہ نے اس کی واپسی کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اس کے نتیجے میں وہ ایک وسیع سلطنت کا مالک بن گیا۔ اس کی عظیم الشان سلطنت کی راجدھانی پاٹلی پتر تھی۔ اس کے بیٹے بندوسار اور پوتے اشوک نے اس کی سلطنت کو مزید مستحکم کیا اور اس کی طاقت اور خوشحالی میں اضافہ کیا۔ اس نے اپنے ہم عصر حکمرانوں مثلاً مصر، یونان، ایشیائے کوچک وغیرہ کے حکمرانوں سے تعلقات قائم کیے۔

موریہ شہنشاہیت میں بے شمار خودمختار قبائلی ریاستیں شامل تھیں جو موریہ شہنشاہ کی اطاعت گزار تھیں۔ برہمنی دور کا بادشاہ شہنشاہ تھا اور اقتدار اعلا کا مالک تھا۔ اس کو تقدس حاصل ہوگیا تھا۔ اس کو سماجی اور اخلاقی نظام کا نجات دہندہ مان لیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ انسانیت کا محافظ اور اپنے دور کا خالق بھی تھا۔ اتنی زبردست پوزیشن کا مالک بن جانے کے بعد شہنشاہ کے مطلق العنان حکمراں بننے کے امکانات تھے۔ اس کی روک تھام کے لیے بادشاہ کے فرائض اور اختیارات کے مقاصد کے بارے میں ایک مجموعۂ قوانین وضع کیا گیا تھا۔ اس کو مذہبی اور سماجی تائید حاصل تھی۔ بادشاہ کو بچپن سے ہی احتیاط کے ساتھ ٹریننگ دی جاتی تھی۔ اس ٹریننگ کے دوران اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ وہ خلوص کے ساتھ لوگوں کی فلاح کے لیے کام کرے، اپنے عہدہ اور اختیارات کو اپنے مفاد کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی بھلائی اور مفاد کے لیے استعمال کرے۔ اس کو تخت نشینی کے وقت بھی اس طرح کا حلف اٹھانا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کو قانون کے مطابق حکومت کرنی ہوتی تھی۔ یہ قوانین ناقابل تنسیخ تھے۔ اس طرح مذہبی احکامات، روایات اور سماجی توقعات بادشاہ

کی مطلق العنانی پر پابندی عائد کرتی تھیں۔ بادشاہ کو اس کے فرائض میں مدد دینے کے لیے ایک وزارتی کونسل یا منتری پریشد ہوتی تھی۔ یہ حکومت کے مختلف شعبوں کو کنٹرول کرتی تھی۔ یہ اس طرح سے بادشاہ پر اثر انداز ہوتی تھی کہ وہ مطلق العنان نہ بن سکے۔

وسیع سلطنت کے فروغ کے ساتھ جمہوری روایات کمزور ہوئیں اور تقریباً سب ہی قبائلی جمہوریتیں موریہ شہنشاہت میں ضم ہوگئیں۔ ان کو اس شرط پر برقرار رہنے دیا گیا تھا کہ وہ شہنشاہ کے اقتدار اعلا کو تسلیم کرلیں۔ شہنشاہ ریاست کی علامت تھا۔ ریاست کا مطلب شہنشاہیت یا عالمگیر سلطنت تھا۔ شاہی اقتدار اعلا نے ایسی نوعیت اختیار کرلی تھی جس کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی۔ اشوک جیسے بادشاہ نے سماجی قوانین وضع کیے اور ان پر عمل درآمد کرایا۔ اس نے مذہبی رواداری کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے اس پر سختی سے عمل کیا۔ اس کی قائم کردہ بادشاہت کا آدرش اس کی موت کے بعد بھی عرصے تک قائم رہا اور قدیم ہندستانی سیاسی نظام کی نمایاں خصوصیت بن گئی تھی۔

موریہ حکومت وحدانی اور متوازن بن گئی تھی۔ اس میں مرکزی اور مقامی انتظامیہ شامل تھی۔ مرکزی انتظامیہ متعدد شعبوں پر مشتمل تھی جن کا مرکز راجدھانی میں اور شاخیں ریاستوں میں ہوتی تھیں۔ مقامی انتظامیہ دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک شہری اور دوسرا دیہی علاقوں کے لیے۔

سیلوکس کے یونانی سفیر میگھستیز کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ شہری انتظامیہ جمہوری اصولوں پر مبنی تھی اور ماڈرن ڈھنگ کی تھی۔ دیہی علاقوں پر بھی توجہ دی جاتی تھی۔ فلاح عامہ کے کام مثلاً اسپتال، کنویں، تالاب، سڑکیں، سرائے، سنگِ میل، اسکول اور پارک وغیرہ کی تعمیر کثرت سے کی جاتی تھی۔ ریاست کردار کے اعتبار سے ایک فلاحی ریاست بن گئی تھی۔

موریہ دور کے بعد یعنی دوسری صدی قبل مسیح اور چوتھی صدی عیسوی کے دوران جو سلطنتیں قائم ہوئیں وہ نہ تو موریہ سلطنت کی طرح دیرپا ثابت ہوئیں اور نہ اتنی وسیع اور ہمہ گیر۔ عام طور سے ان حکمرانوں نے اپنے اپنے مذہب کے تئیں جانبدارانہ رویہ اپنایا اور اپنے مذہب کے اصولوں کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اس دور کے بادشاہوں نے اپنے لیے خدا کا بیٹا اور عظیم برہمن جیسے القابات وضع کیے۔ سیاسی نظریے کے طور پر اب بادشاہ کو عظیم خدا کا انسانی قالب کہا جانے لگا۔ ان باتوں سے مذہب کے تئیں جانبدارانہ رویے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سیاسی نظریے کے مطابق اب ریاست سات اجزا یعنی بادشاہ، وزارت، اتحادی، مالیات، قانون و انصاف کا نظام، دفاع اور فوج پر مشتمل تھی۔ اس دور میں بین ریاستی تعلقات کے بارے میں بھی کچھ متعین نظریے ابھرے اور موجود ڈپلومیسی کے کچھ مقاصد اور طریقے اپنائے گئے۔

غرض یہ کہ تیسری صدی عیسوی کے آخر تک ہندستانی سیاسی نظام نے نظریاتی اور عملی دونوں لحاظ سے بلوغت کی منزلیں طے کرلی تھیں۔

چوتھی صدی کے شروع میں گپت سلطنت قائم ہوئی۔ یہ مختلف حیثیتوں سے موریہ سلطنت سے بھی بازی لے گئی۔ اس کا دور حکومت تقریباً دو صدی تک رہا۔ اس دور میں پورا ہندستان ایک بار پھر متحد ہوکر ایک سیاسی اکائی بن گیا۔ یہ سلطنت مستعدی کا نمونہ تھی اور ایک فلاحی ریاست تھی۔ اس نے مذہبی رواداری کی پالیسی اختیار کی اور ادب و آرٹ کی سرپرستی کی، غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کی۔ اس دور کو قدیم ہندستان کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں بادشاہ کو خدا کا انسانی روپ سمجھا جاتا تھا۔ اس کو سماجی بھلائی اور سب کو مسرت بخشنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ موریہ دور کی طرح اس دور کی ریاست بھی ایک فلاحی ریاست تھی۔

سلطنتوں کے عروج و زوال کا اثر گاؤں پر نہیں پڑا۔ وہاں کا خود مختار نظام برقرار رہا۔ اس کی زندگی اور معیشت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کے برعکس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہاں امن و سکون قائم رہا۔ جنگی قوانین اور ڈپلومیسی میں گاؤں کو تباہ کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ اس طرح سے گپت دور کے آخر تک ہندستانی سیاسی نظام کے ارتقا میں پانچ اہم خصوصیات ظاہر ہوئیں۔ یہ تھیں شہنشاہیت کا آدرش، بادشاہ کا تقدس، مذہبی رواداری کی پالیسی، گاؤں کی خودمختاری اور فلاحی ریاست کی روایات۔ ان سیاسی روایات، اداروں اور آدرشوں نے بعد کے زمانے کے لیے ماڈل کا کام کیا تھا۔

چھٹی صدی کے آخر تک گپت سلطنت کا زوال ہوگیا تھا۔ شمالی اور جنوبی ہندستان اس کے ایک ہزار سال بعد تک پھر کبھی ایک بادشاہ کے تحت متحد نہیں ہوئے۔ یہ اتحاد دوبارہ مغلوں کے دور میں قائم ہوا۔ آٹھویں صدی میں مسلمانوں نے سندھ پر اپنی حکومت قائم کی لیکن انھوں نے کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑا۔ ایک عرصے بعد جب مسلمانوں نے اس ملک میں اپنی مستقل سلطنتیں قائم کیں اور اس ملک کو اپنا وطن بنایا تو وہ قدیم ہندستان کی سیاسی روایات اور اداروں سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس سے ہند۔ اسلامی سیاسی نظام کا آغاز ہوا۔ محمود غزنوی، علاء الدین خلجی اور شیرشاہ نے اس کی بنیادیں ڈالیں اور اکبر نے عمارت کی تکمیل کی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے اشتراک سے ایک ایسے سیاسی نظام کا جنم ہوا جو نہ ہندو تھا اور نہ اسلامی بلکہ جس میں دونوں نظاموں کے اجزا شامل تھے۔

□□□

زبیر احمد بھاگلپوری کیریئر گائیڈنس

ایئر کیبن میں روزگار کے مواقع

ہوائی جہازوں کے ذریعے نہ صرف طویل مسافت کم وقت میں طے ہوجاتی ہے بلکہ اس کے ذریعے سفر کرنا مسافروں کو تفریح اور کیف و سرور کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار لوگوں کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ زندگی میں کم از کم ایک بار ہوائی جہاز میں سوار ہونے کا موقع حاصل کریں لیکن اگر کوئی جہاز کے عملے میں ہی شامل ہوجائے تو پھر نہ صرف اس کی تمنا پوری ہوگی بلکہ اس کے لیے روزگار کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔ اس میں نوجوانوں کے لیے شاندار کیریئر ہے جہاں تنخواہ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ یہ تنخواہ کام کی مدت، عملے کی صلاحیت کے علاوہ ادارے کے نیٹ ورک کی بنیاد پر طے ہوتی ہے۔ اس عملے کو ایئر لائنس کی اصطلاح میں ''ایئر کیبن کرو'' کہا جاتا ہے۔

ایئر کیبن کے عملے میں شامل ہونا یقیناً فخر کی بات ہے۔ واضح رہے کہ پائلٹ بھی ایئر کیبن کا ہی عملہ ہوتا ہے جسے اپنے کام میں تعاون کے لیے کئی دیگر عملوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان عملوں کو بطور تنخواہ خطیر رقم ملنے کے ساتھ ساتھ سماج میں بے حد عزت کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ ایئر کیبن میں کئی عہدے ہوتے ہیں جن میں فلائٹ سوپروائزر، ایئر ہاسٹس اور فلائٹ اٹنڈنٹس شامل ہیں۔

ذمے داریاں:

ہوائی جہاز میں سفر کر رہے تمام مسافرین کی نگہبانی، تحفظ اور سہولیات کی فراہمی کی ساری ذمے داری ایئر کیبن کے عملوں کی ہوتی ہے۔ مسافروں کو موسم کی جانکاری، بادلوں کی صورت حال، سفر سے متعلق ضوابط کی جانکاری اور دیگر حقائق سے متعلق معلومات فلائٹ اٹنڈنٹ فراہم کرتے ہیں۔ وہ حفاظتی انتظامات کے لیے ہنگامی حالات کی خبر دینے والے آلات کی جانچ پڑتال بھی کرتے ہیں۔ جہاز کی صفائی، نشستوں کے بہتر نظم، مسافروں اور ٹریفک دستے کے لیے خورد و نوش کا نظم اور بنیادی امدادی سامانوں کی جانچ بھی انھی عملوں کے ذریعے کی جاتی ہے۔

دراصل فلائٹ اٹنڈنٹ کا کام اسی وقت شروع ہوجاتا ہے جب مسافر جہاز میں سوار ہوتے ہیں۔ وہ مسافروں کا خیرمقدم کرنے کے بعد ٹکٹ کی بنیاد پر مختص سیٹ پر انھیں بٹھاتا ہے اور سفر شروع ہونے سے قبل اور جہاز کے اترنے سے پہلے مسافروں کو سیٹ بیلٹ باندھنے کی صلاح دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ عملے ہنگامی حالات میں جان بچانے کا سامان مسافروں کو فراہم کرکے باہر نکالنے میں مدد کرتے ہیں۔ اگر دوران سفر کسی مسافر کی صحت خراب ہوجاتی ہے تو اس کا ابتدائی علاج ایئر ہاسٹس کرتی ہیں۔ ان عملوں کا کام صحیح معنوں میں چیلنج سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ انھیں مختلف مزاج و خیالات کے لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک تھکا دینے والا کام ہے جس میں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی محنت کرنی پڑتی ہے۔ بہت سے مسافر اتنے نازک مزاج ہوتے ہیں کہ تھوڑی بہت غلطیاں بھی برداشت نہیں کر پاتے۔ ان کی نزاکت ایئر کیبن کے عملوں کو ہی جھیلنی پڑتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عام طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ متحمل مزاج، خلیق، ملنسار اور مختلف خصوصیات کے حامل امیدوار ہی ایئر کیبن کے عملوں میں شامل ہوں تاکہ وہ وقت بوقت مسافرین کے ناز و نخوت کو بھی برداشت کرسکیں اور چھوٹے بڑے مسئلے کا فوری طور پر خوش اسلوبی سے حل نکال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے گھروں سے دور رہ کر چیلنجوں کا سامنا کرنے والے لڑکے لڑکیوں کو ہی ایئر کیبن میں کام کرنے کا موقع مل پاتا ہے۔

اہلیتی شرائط:

ایئر کیبن میں مختلف اسٹاف ہوتے ہیں جن کی اہلیت کی شرطیں الگ الگ ہوتی ہیں لیکن ایک متعینہ معیار بھی ہے جہاں تک سبھی کو پہنچنا پڑتا ہے یعنی یہ شرائط سب کے لیے مشترک ہیں۔

(i) کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری فرسٹ کلاس کے ساتھ ہو۔

(ii) انگریزی اور ہندی زبان پر عبور حاصل ہو۔

(iii) اگر آپ مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی زبانوں کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو آپ کے انتخاب کا امکان خود بخود بڑھ جاتا ہے۔

(iv) ہوٹل مینجمنٹ میں ڈگری/ڈپلوما رکھنے والے امیدوار بھی تحریری امتحان میں شامل ہوسکتے ہیں۔

(v) وہ خواتین امیدوار، جنھوں نے ہوم سائنس میں گریجویشن کیا ہے، قابل ترجیح ہیں۔

(vi) کسٹمرس سروس ایریا میں کام کرنے کا تجربہ رکھنے والی لڑکیوں کو انتخاب میں ترجیح دی جاتی ہے۔

(vii) N.C.C. میں رہ چکے طلبہ اور اسکاؤٹ اینڈ گائڈ کے طلبہ کیبن عملے کے لیے اہل سمجھے جاتے ہیں بشرطیکہ وہ تعلیمی اہلیت پوری کرتے ہوں۔

(viii) مقامی زبانوں میں تمل، تیلگو، کنڑ اور ملیالم زبان کو ترجیح دی جاتی ہے جبکہ بین الاقوامی زبانوں میں فرنچ، عربی، چینی، جرمنی، ہسپانوی، پرتگالی اور اطالوی کو قابل ترجیح مانا جاتا ہے۔

عمر:

مختلف ایئر لائنس نے ایئر کیبن عملوں کے لیے الگ الگ اہلیت طے کر رکھی ہے، اس لیے امیدواروں کی حد عمر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایئر ہاسٹس کے لیے عام طور سے 18 سے 22 سال کی لڑکیوں کا انتخاب کیا جاتا ہے جبکہ مردوں کے

لیے حد عمر زیادہ سے زیادہ 26-25 سال ہے۔ چاہے آپ مرد ہوں یا خاتون، مطلوبہ حد عمر میں آپ کی ذاتی صلاحیت، ڈگری اور تجربے کی بنیاد پر رعایت ملتی ہے۔ بین الاقوامی ہوابازی ڈائرکٹوریٹ کے ذریعے معینہ معیار کے مطابق ائیرلائنس کمپنیاں 18 سے 20 سال کے اہل امیدواروں کو ایئرکیبن عملوں میں رکھ سکتی ہیں۔ اگر آپ کی صحت موافق ہے تب ہوابازی کمپنیاں کئی بار حد عمر کو نظرانداز کردیتی ہیں۔

جسمانی اہلیت:

امیدواروں میں اکثر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ایئرلائنس کمپنیاں صرف گورے چٹے اور خوبصورت قد و قامت والے لوگوں کو ہی ایئرکیبن کے عملوں کے لیے منتخب کرتی ہیں۔ یہ بات کلی طور پر صحیح نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اسمارٹ اور پرکشش نوجوانوں کی تلاش ہوتی ہے لیکن گورا ہونا لازمی شرط نہیں۔ پانچ فٹ چھ یا سات انچ کی لمبائی سے کم کے امیدوار عموماً ایئرکیبن کے عملوں کے لیے منتخب نہیں ہوتے۔ ایئرلائنس کمپنیوں کو پرکشش، خوش گفتار، صحت مند اور پرعزم نوجوانوں کی خواہاں ہوتی ہیں۔ یہاں پرکشش کا مطلب دیکھنے میں بہتر، خوش اخلاق اور نرم گفتار لڑکے لڑکیوں کا ہونا ہے جن بیماریوں سے امیدواروں کو بچنے کی صلاح دی جاتی ہے ان میں سردی، کھانسی، نمونیا، ملیریا، ایڈس اور کینسر جیسی بیماریاں شامل ہیں۔ امیدواروں کا وزن ان کی لمبائی کے تناسب میں ہونا چاہیے۔ انھیں چشمہ نہیں پہننے رہنا چاہیے۔ جہاں تک بصارتی صلاحیت کی بات ہے، 6/6 سب سے زیادہ قابل قبول ''وژن پاور'' مانا جاتا ہے۔

انتخابی عمل:

وقتاً فوقتاً مختلف ایئرلائنس کمپنیوں کے ذریعے اسامیاں اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ''روزگار سماچار'' میں بھی اس کے لیے اشتہار شائع ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی انتخابی عمل کی بہ نسبت ہندستان میں ایئرکیبن کے عملوں کا انتخاب قدرے الگ طریقے سے ہوتا ہے۔ اخباروں میں اسامیوں کے اشتہارات کے بعد اہل امیدواروں کو تحریری امتحان کے لیے کال لیٹر ارسال کیا جاتا ہے۔ تحریری امتحان دہلی، ممبئی، کلکتہ، مدراس، پٹنہ اور لکھنؤ سمیت ملک کے ہر بڑے شہر میں منعقد ہوتا ہے۔ اس میں معلومات عامہ، انگریزی، ریاضیات ذہانت جانچ کے زمرے سے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

امتحان کا دوسرا مرحلہ انٹرویو کا ہوتا ہے۔ اس میں طلبہ کو جماعتی مذاکرے (گروپ ڈسکشن) میں حصہ لینے کے لیے کہا جاتا ہے۔ پھر ان کی شخصیت کی جانچ ہوتی ہے جسے ''پرسنالیٹی ٹسٹ'' کہتے ہیں۔ شخصیت کی جانچ کے دوران آنرس سبجیکٹ اور ان کی دلچسپی کے زمرے سے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ ایئرلائنس کمپنیوں کو دو زمروں میں رکھا جاتا ہے۔ پہلے زمرے میں روایتی کمپنیاں آتی ہیں جن میں داخلے کے لیے ذاتی صلاحیت پر مبنی سوال پوچھے جاتے ہیں اور پھر داخلے کے بعد عملوں کو مختلف تربیتی مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ دوسرے زمرے میں جدید ہوائی کمپنیاں آتی ہیں۔ ان میں داخلے کے لیے امیدوار کا تجربہ کار ہونا، اعلا تعلیم یافتہ ہونا اور تکنیکی علم سے آراستہ ہونا لازمی ہے۔ ان کمپنیوں میں داخلے کے لیے ہر امیدوار کو ہوابازی صنعت کے تاریخی پس منظر سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جہاز کی عام سرگرمیوں سے لے کر ہنگامی حالات تک کی تربیت انتخاب کے بعد امیدواروں کو ملتی ہے۔

تنخواہ:

اعلا اور شاندار شرح تنخواہ ہوابازی صنعت کی خصوصیت ہے۔ چونکہ اس میں مختلف گریڈ کے عملے ہوتے ہیں، اس لیے ان کی شرح تنخواہ بھی مختلف ہوتی ہے۔ ایک عام اصول کے مطابق تمام سہولیات کو چھوڑ کر ایئرکیبن کے عملے بیس سے پچیس ہزار تک ماہانہ پاتے ہیں۔ اس میں اضافی فائدے الگ سے شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ رقم حکومت ہند کے زیر اہتمام ایئرانڈیا اور انڈین ایئرلائنس میں بھی اس شرح سے دی جاتی ہے۔ نجی زمرے کی ہوائی کمپنیاں اور بین الاقوامی کمپنیاں اپنے یہاں کام کر رہے کیبن عملوں میں ہر ایک کی سالانہ تنخواہ 125000-175000 ڈالر دیتی ہیں۔ یہ تنخواہ ریگولر ملازمین کو ملتی ہے نہ کہ زیر تربیت کارکنوں کو۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیں کہ امیدواروں کے انتخاب کے بعد 5 سے 25 ہفتے تک ہوابازی کمپنیاں ان عملوں کو تربیت دیتی ہیں۔ تربیت کے دوران ہی ان کی تنخواہ متعین ہوتی ہے۔ کمپنیاں اپنے حساب سے انھیں ہوائی سفر بھتہ بھی ادا کرتی ہیں۔

کیبنی عملے کے طور پر آپ کے کیریئر کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب تک آدمی مکمل طور پر صحت مند ہوتا ہے، چابکدستی اور خوش اسلوبی سے کام انجام دیتا رہتا ہے، غلطیوں سے ہرممکن بچا رہتا ہے، اس کی مانگ بنی رہتی ہے لیکن عموماً 45 سے 50 تک پہنچتے پہنچتے اسے سبکدوش ہوجانا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا کیریئر ختم ہوجاتا ہے، ہوابازی صنعت کے مینجمنٹ سیکشن میں وہ اب بھی اپنی جگہ بناسکتے ہیں بشرطیکہ انھیں خود کو اپ ڈیٹ رکھنا آتا ہو۔

تربیتی ادارے:

(1) ڈین ٹور اینڈ ٹریول (پرائیویٹ) لمیٹڈ، سیوا پربندھن کیندر، بی. 203، ویسٹ منسٹر (بکنگھم روڈ)، بنگلور۔560052

(2) سہارا ایوی ایشن اکادمی

(3) اسکائی لائن ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ، لکشمن پبلک اسکول کیمپس حوض خاص، نئی دہلی-110016

(4) فلائی ٹیک ایوی ایشن اکادمی، 102، کاسترا اسٹریٹ نمبر-1، روڈ نمبر-10، ویسٹ مارڈپلی، سکندرآباد-500026

Deptt. of Urdu, Bihar Legislative Council,
Patna-800015

□□□

امیت جین، سمرات شرما، سوربھ بنرجی

پاور پوائنٹ کا تعارف

پاور پوائنٹ کا تعارف

کیا آپ سائنس پسند کرتے ہیں؟ یقیناً آپ پسند کرتے ہوں گے۔ اگر بطور بحث ہم یہ فرض کرلیں کہ آپ کو ایک سائنس پروجیکٹ بنانا ہے۔تو آپ اس کے لیے کیا کریں گے؟ فرض کریں کہ آپ کو ایک اسپلیش (Splash) بنانا ہے اور آپ نہیں چاہتے کہ اکتانے والی پرانی بوسیدہ کتابیں یا چارٹ کو دہرائیں۔ آپ کو ایک ایسا پروجیکٹ بھی پیش کرنا ہے جو موثر، خوبصورت، نشاط انگیز ہو اور اس کی تیاری میں زیادہ وقت بھی نہ لگے اور نہایت دلچسپ ہو تو دوستو اس کے لیے مائکروسافٹ پاور پوائنٹ میں آپ کا استقبال ہے۔

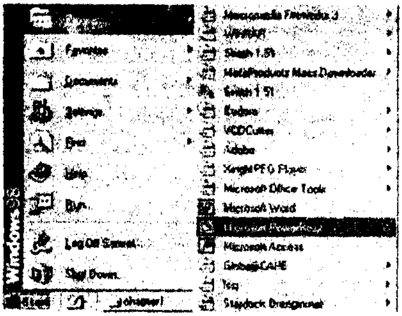

پاور پوائنٹ بالکل مائکروسافٹ آفس کی طرح ہے جو آپ کو پیشہ ورانہ پریزنٹیشن (Presentation) پر قادر بناتا ہے۔ یہ آپ کو اس قابل بنائے گا کہ آپ کسی ٹیکسٹ، گرافس، تصویر یا امیج کو بلاتردد بآسانی پیش کرسکیں۔

آفس (Office) کا جدید ترین ورزن آفس اکس پی ہے لیکن Office 2000 یا Office 97 بھی بہت سے اداروں میں معیاری تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس مضمون میں ہم نے Office 2000 کو معیار بنایا ہے۔ مضمون کی مدد سے آپ کو ان بنیادی باتوں کا بھی علم ہوسکے گا جو آپ کے ورزن میں نہیں ہیں۔ کیا آپ ایسا نہیں چاہیں گے؟ جی ہاں۔ آؤ پاور پوائنٹ شروع کریں۔

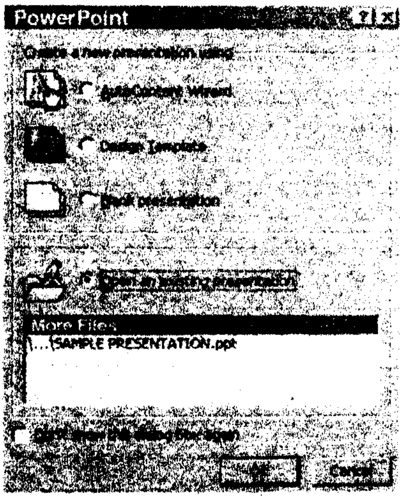

پاور پوائنٹ کی شروعات

پاور پوائنٹ شروع کرنے کے لیے آپ کو صرف ونڈوز مینو کے اسٹارٹ بٹن کو دبانا ہے اور پروگرام مینو سے مائکروسافٹ پاور پوائنٹ کو سلیکٹ کرنا ہے۔

جب ایسا کریں گے ایک ڈائیلاگ باکس سامنے ظاہر ہوگا۔

اب بلینک پریزنٹیشن آپشن (Blank Presentation

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز سی.ایس.آئی.آر یونٹ نے طلبہ اور عام شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے "سب کے لیے آئی ٹی سیریز" کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو انھیں کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین "اردو دنیا" کے لیے اس سیریز کی کتاب "مائکروسافٹ پاور پوائنٹ" سے اقتباس پیش ہے۔

Option) کو سلیکٹ کریں اور Ok پر کلک کریں۔ ایک آٹو کنٹینٹ آپشن آپ کو ایک معمولی ویزارڈ کے ذریعے پریزنٹیشن تیار کرنے پر قادر بنادے گا جہاں ٹمپلیٹ آپشن کی مدد سے آپ کو ٹمپلیٹ رینج مل جائے گا تاکہ اپنی پسند کا انتخاب کرسکیں۔ مزید برآں آیئے دیکھیں کہ پاور پوائنٹ Work Space پہلی دفعہ کیسا نظر آتا ہے۔

ورک اسپیس (Work Space)

پاور پوائنٹ کا اسکرین کچھ اس طرح دکھائی دے گا:

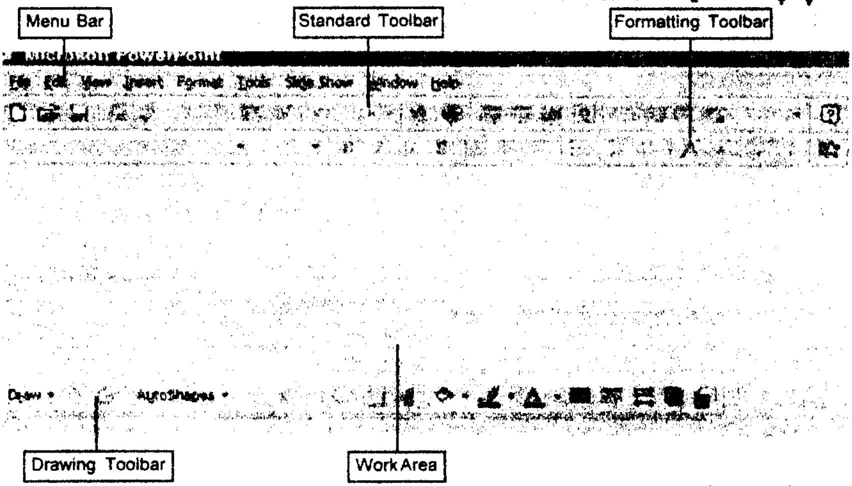

آؤ دیکھیں کہ یہ ترکیبی اجزا (Components) کیا کیا کام کرتے ہیں۔

مینو بار (Menu Bar)

مینو بار میں فائل، ایڈٹ، ویو، انسرٹ، فارمیٹ، ٹولس، ونڈو اور ہیلپ مینو ہوتے ہیں۔ یہ ورلڈ مینو کی طرح ہی کام کرتے ہیں۔ علاوہ

ازیں پاور پوائنٹ میں سلائڈ شو (slide show) مینو بھی ہوتا ہے۔ اس مینو میں بہت سے آپشن ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم ان کے بارے میں رفتہ رفتہ پڑھیں گے۔

اسٹینڈرڈ ٹول بار (Standard Toolbar)

اسٹینڈرڈ ٹول بار مینو بار کے نیچے ہوتا ہے۔ یہ مینو کاغذ کے لیے شارٹ کٹ مہیا کرتا ہے۔ یہ آپ کو عملی کام کرنے پر قادر بنائے گا مثلاً نئی یا پرانی فائلیں کھولنا، فائل کو سیو یا پرنٹ کرنا، ٹیکسٹ اور آبجیکٹس کو کاٹنا اور انھیں پیسٹ کرنا اور آخری دفعہ کیے گئے کام کو اَن ڈو یا ری ڈو کرنا وغیرہ۔

(جاری)

پرویز احمد اعظمی کوئز

مختلف ممالک کی کرنسیاں

اس شمارے سے کوئز کو انعامی مقابلہ بنایا جارہا ہے۔ صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اگلے مہینے کی 10 تاریخ تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) کرنسی کسے کہتے ہیں؟
(الف) امریکہ میں چلنے والے سکے کو
(ب) بھارت میں چلنے والے سکے کو
(ج) جاپان میں چلنے والے سکے کو
(د) کسی بھی ملک میں چلنے والے سکے کو

(2) الجزائر کی کرنسی کا کیا نام ہے؟
(الف) ڈالر (ب) الجزائری ڈالر
(ج) الجزائری درہم (د) الجزائری دینار

(3) ''پاؤنڈ اسٹرلنگ'' کرنسی ہے:
(الف) کناڈا کی (ب) جاپان کی
(ج) انگلینڈ کی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(4) ''روبل'' کن ممالک کی کرنسی ہے؟
(الف) ارجنٹینا، آسٹریا، بلجیم
(ب) جارجیا، آذربائیجان، تاجکستان
(ج) بحرین، کویت، سعودی عرب
(د) ان میں سے کوئی نہیں

(5) بنگلہ دیش کی کرنسی کو کس نام سے جانا جاتا ہے؟
(الف) ٹکا (ب) روپیہ
(ج) ڈالر (د) ان میں سے کوئی نہیں

(6) ''دینار'' کس ملک کی کرنسی ہے؟
(الف) بحرین (ب) کویت
(ج) بولیویا اور کروشیا (د) ان میں سے کوئی نہیں

(7) بحرین کے رائج الوقت سکے کو کس نام سے جانا جاتا ہے؟
(الف) بحرینی دینار (ب) دینار
(ج) ریال (د) ان میں سے کوئی نہیں

(8) وہ کون سی کرنسی ہے جو کروشیا، بولیویا اور بوسنیا ہرزگووینا میں رائج ہے؟
(الف) دینار (ب) ریال
(ج) لیو (د) ان میں سے کوئی نہیں

(9) ''لیو'' کہاں کی کرنسی ہے؟
(الف) چین کی (ب) برازیل کی
(ج) ہنگری کی (د) بلگاریا کی

(10) افغانستان میں چلنے والی کرنسی کا نام کیا ہے؟
(الف) روپیہ (ب) رین من بی
(ج) افغانی (د) ڈالر

(11) جاپان، کوریا اور ہنگری کی بالترتیب کرنسیاں ہیں:
(الف) فورنٹ، وون ین (ب) ین، وون، فورنٹ
(ج) وون، فورنٹ، ین (د) ان میں سے کوئی نہیں

(12) ''لی را'' کس یورپی ملک کی کرنسی ہے؟
(الف) انگلینڈ (ب) جرمنی
(ج) فرانس (د) اٹلی

(13) چین میں چلنے والی کرنسی کا نام ہے؟
(الف) کرونے (ب) رین من بی
(ج) ٹگرک (د) ان میں سے کوئی نہیں

(14) ''درہم'' کرنسی ہے:
(الف) موزنبو کی (ب) منگولیا کی
(ج) ایران کی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(15) درج ذیل میں سے ملیشیا کی کرنسی کون سی ہے؟
(الف) ٹکا (ب) ٹگرک
(ج) گلڈر (د) رنگٹ

(16) برطانیہ کی کرنسی پاؤنڈ ہے اور مصری کرنسی ہے:

(الف) ڈالر (ب) پاؤنڈ
(ج) مصری پاؤنڈ (د) مصری درہم

(17) انڈونیشیا کی کرنسی کا نام:
(الف) روپیہ (ب) روپیاہ
(ج) ریال (د) دینار

(18) ایران کی کرنسی کو کہتے ہیں؟
(الف) ریال (ب) دینار
(ج) درہم (د) رنیگل

(19) ارجنٹینا کی کرنسی ہے:
(الف) پی سو (ب) ارجنٹینائی پی سو
(ج) ارجنٹینائی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(20) پاکستان میں چلنے والی کرنسی ہے:
(الف) بھارتی روپیہ (ب) پاکستانی ریال
(ج) پاکستانی دینار (د) پاکستانی روپیہ

(21) فرنچ فرینک کس ملک میں چلنے والی کرنسی ہے؟
(الف) جرمنی (ب) اٹلی
(ج) انگلستان (د) فرانس

(22) ''ری یئل'' کس ملک کی کرنسی ہے؟
(الف) برازیل (ب) برونئی
(ج) بحرین (د) بیلجیم

(23) چیک ریپبلک کی کرنسی کا کیا نام ہے؟
(الف) چیک ڈالر (ب) چیک روپیہ
(ج) چیک کورونا (د) ان میں سے کوئی نہیں

(24) برونئی کے رائج الوقت سکے کو کس نام سے جانا جاتا ہے؟
(الف) برونئی ڈالر (ب) برونئی فرینک
(ج) برونئی ریال (د) ان میں سے کوئی نہیں

(25) کناڈا کی کرنسی کا نام کیا ہے؟
(الف) کینیڈیائی ڈالر (ب) امریکی ڈالر
(ج) یورو (د) ان میں سے کوئی نہیں

(26) سری لنکا کی رائج الوقت کرنسی ہے:
(الف) سری لنکائی روپیہ (ب) روپیہ
(ج) سری لنکائی ڈالر (د) ان میں سے کوئی نہیں

(27) متحدہ عرب امارات کی کرنسی کا کیا نام ہے؟
(الف) ریال (ب) دینار
(ج) درہم (د) متحدہ عرب امارات کا درہم

(28) 'روبل' جارجیا، آذربائی جان اور تاجکستان کے علاوہ کن ممالک میں رائج ہے؟
(الف) مصر، ترکی اور یونان
(ب) ترک مینستان، لتھوانیا اور قزاقستان
(ج) چیچنیا، بیلاروس، کرگیزستان
(د) ان میں سے کوئی نہیں

(29) جنوبی افریقہ کی کرنسی کو کہتے ہیں:
(الف) پاؤنڈ (ب) وون
(ج) رینڈ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(30) سعودی عرب کی کرنسی کا نام ہے:
(الف) سعودی دینار (ب) سعودی درہم
(ج) سعودی ڈالر (د) سعودی ریال

(31) ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کرنسی کو دنیا میں کس نام سے جانا جاتا ہے؟
(الف) امریکی پاؤنڈ (ب) امریکی ڈالر
(ج) امریکی اسٹرلنگ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(32) اسپین کی کرنسی کس نام سے مشہور ہے؟
(الف) کورونے (ب) کرمی یئل
(ج) پے سے ٹا (د) ان میں سے کوئی نہیں

(33) جرمنی کی کرنسی ہے؟
(الف) ڈائچ مارک (ب) ڈائچ اسٹرلنگ
(ج) کرونے (د) ان میں سے کوئی نہیں

(34) آسٹریا کی کرنسی ہے؟
(الف) آسٹریائی پونڈ (ب) آسٹریائی شیلنگ
(ج) آسٹریائی اسٹرلنگ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(35) بیلجیم کی کرنسی کو دنیا میں کس نام سے جانا جاتا ہے؟
(الف) بیلجیائی اسٹرلنگ (ب) بیلجیائی شیلنگ
(ج) بیلجیائی فرینک (د) ان میں سے کوئی نہیں

(36) عراق کی کرنسی کو کہتے ہیں؟
(الف) عراقی ریال (ب) عراقی دینار
(ج) عراقی ڈالر (د) ان میں سے کوئی نہیں

(37) ہانگ کانگ کی کرنسی کو کہتے ہیں:
(الف) ایچ کے ڈالر (ب) ایچ کے پاؤنڈ
(ج) ایچ کے دینار (د) ان میں سے کوئی نہیں

(38) سنگاپور کی کرنسی ہے:
(الف) سنگاپوری روپیہ (ب) سنگاپوری پاؤنڈ

(ج) سنگاپوری ڈالر (د) ان میں سے کوئی نہیں

(39) نیدرلینڈ کی کرنسی کا کیا نام ہے؟

(الف) ڈالر (ب) پاؤنڈ

(ج) روپیہ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(40) کویت کی کرنسی کا نام کیا ہے؟

(الف) کویتی درہم (ب) کویتی دینار

(ج) کویتی ریال (د) ان میں سے کوئی نہیں

(41) ناروے کی کرنسی کی نشاندہی درج ذیل کرنسیوں میں سے کیجیے؟

(الف) ٹگرک (ب) وون

(ج) کرونے (د) ان میں سے کوئی نہیں

(42) اردن (جارڈن) کی کرنسی کا نام ہے:

(الف) ریال (ب) جارڈینیائی دینار

(ج) جارڈینیائی درہم (د) ان میں سے کوئی نہیں

(43) سوئٹزرلینڈ کی کرنسی ہے:

(الف) سوئس فرینک (ب) سوئس ڈالر

(ج) سوئس چے سو (د) ان میں سے کوئی نہیں

(44) قطری کرنسی کا کیا نام ہے؟

(الف) قطری دینار (ب) قطری ریال

(ج) قطری درہم (د) ان میں سے کوئی نہیں

(45) "ٹگرک" کس ملک کی کرنسی کا نام ہے؟

(الف) فلپائن (ب) اسرائیل

(ج) منگولیا (د) ان میں سے کوئی نہیں

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے اے نیل کنٹھ شاستری

مترجم: آر کے بھٹناگر

جنوبی ہند کی تاریخ پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں جنوبی ہند کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصفِ اوّل تک کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 576، قیمت: 114 روپے

دکنی نثر کا انتخاب

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت 45 روپے

سخنورانِ گجرات

مرتب: سیّد ظہیرالدین مدنی

گجرات میں اردو شعروادب کی نشاندہی پندرھویں صدی کے نصف آخر سے کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سے 1950 تک کے شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ، سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ درج ہے۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات: 340، قیمت: 77 روپے

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: ڈاکٹر سیّدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار محمد قلی قطب شاہ بہ یک وقت کئی اوصاف سے متصف تھا۔ اس کا ایک اہم وصف شعرگوئی بھی تھا۔ یہ اس کا مستند کلیات ہے جس میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 824، قیمت: 157 روپے

قطب مشتری

مصنف: اسداللہ وجہی

"قطب مشتری" اردو کی ابتدائی طبع زاد مثنویوں میں کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مثنوی کے متن کے ساتھ سو صفحوں پر مشتمل عالمانہ مقدمے نے کتاب کی قدر و قیمت مزید بڑھادی ہے۔

(چوتھا ایڈیشن)

صفحات: 234، قیمت: 48 روپے

کلیاتِ سراج

سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی اردو کے کلاسیکل شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ دیباچے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے شخصی اوصاف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 732، قیمت: 138 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

جاوید اقبال

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو۔20

بڑھتے قدم

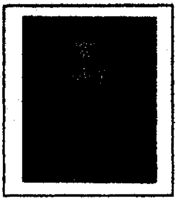

محمد انوار کا تعلق مالیر کوٹلہ، پنجاب کے ایک متوسط طبقے سے ہے۔ محمد انوار نے مالیر کوٹلہ سے ہی گریجویشن کیا اور قومی اردو کونسل کی طرف سے دارالسلام اسلامک سینٹر، مالیرکوٹلہ میں چلائے جارہے کمپیوٹر سینٹر سے ڈپلوما اِن کمپیوٹر اپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. کورس کیا اور اس کورس کی بدولت آج برسرِروزگار ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ "اردو دنیا" کی نذر ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: جب مجھے معلوم ہوا کہ مالیر کوٹلہ میں دارالسلام اسلامی مرکز میں کمپیوٹر سینٹر قائم ہوا ہے تو اس کی اہمیت کے پیشِ نظر میرے اندر یہ کورس کرنے کا شوق پیدا ہوا۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: میں نے دوسرے سینٹروں میں دیکھا ہے کہ ان کا مقصد صرف اپنے کاروبار کو بڑھانا ہوتا ہے۔ وہ بہت زیادہ فیس وصول کرتے ہیں اور اتنی اچھی رہنمائی بھی نہیں دیتے لیکن یہاں صورتِ حال مختلف ہے۔ قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں کا مقصد منافع کمانا نہیں بلکہ خدمتِ خلق ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے۔ اس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: دوسرے سینٹروں کے بارے میں تو میں زیادہ نہیں جانتا لیکن دارالسلام میں جو تربیت کا طریقہ ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ ہر سطح کے طالب علم یہاں کی تربیت سے مطمئن ہیں۔ طلبہ کو کسی بھی قسم کی دقت یا دشواری پیش نہیں آتی۔ یہاں کی فیکلٹی طلبہ کی پوری رہنمائی کرتی ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی یہ ایک کامیاب کوشش ہے، کونسل کا کمپیوٹر ڈپلوما چوں کہ منظور شدہ ہے اور DOEACC سوسائٹی بھی اس کی سند دیتی ہے اس لیے یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے روزگار اور ملازمت حاصل کرنے کے زیادہ مواقع ہیں۔ مجھے بھی اس کورس کی بدولت ہی ملازمت ملی ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: میرے اندر زیادہ اعتماد پیدا ہوگیا ہے، میں دوسروں سے پیچھے نہیں ہوں۔ آج میں نئے دور کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو پوری طرح تیار پاتا ہوں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ میری خود اعتمادی کافی بڑھ گئی ہے اور میں یہ صاف طور پر محسوس کرتا ہوں۔ ملازمت حاصل ہونے کے بعد یقیناً میری خود انحصاری میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس کے لیے میں قومی اردو کونسل اور دارالسلام اسلامی مرکز کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس انفرادیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: اس سینٹر کا دوسرا احسان مجھ پر یہ ہے کہ یہاں پر مجھے اردو جیسی اچھی اور میٹھی زبان سیکھنے کا موقع ملا۔ اردو لکھنے پڑھنے کا مجھے ہمیشہ سے شوق تھا لیکن کبھی موقع نہیں ملا۔ زبانیں جاننے والے کے لیے مارکیٹ میں کافی جگہ ہے اور مواقع بھی۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی ہے، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہیں تھی؟

جواب: یہ فیس کورس کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس لیے ہمیں کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوا اور پھر ہمارے سینٹر نے بھی کافی تعاون کیا مثلاً فیس کے لیے کبھی بھی پریشان کن تقاضے نہیں کیے۔

411, Mansarover Hostel,
University of Delhi, Delhi-7

□□□

اردو خبرنامہ

''ہندستانی مشترکہ کلچر کی تعمیر: سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی خدمات'' تین روزہ سمینار

● نئی دہلی، 4رفروری۔ ''ملک میں آج جو صورت حال ہے اس میں تبدیلی لانے کے لیے ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے انقلاب کی جس کی شروعات 1936 میں سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے ترقی پسند تحریک کی شکل میں کی تھی۔'' ان خیالات کا اظہار غالب انسٹی ٹیوٹ، ماتا سندری لین، نئی دہلی میں مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ترقی پسند مصنفین کے اشتراک سے 4 تا 6رفروری کے درمیان منعقدہ تین روزہ قومی سمینار بعنوان ''ہندستانی مشترکہ کلچر کی تعمیر: سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی خدمات'' کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ سجاد ظہیر جیسے انسان تاریخ کے کسی ایک کونے میں رہنے کے عادی نہیں ہیں۔ آج سجاد ظہیر صدی منانے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ 1936 میں ملک کی جو صورت حال تھی آج بھی ملک کم و بیش انھی حالات سے دو چار ہے۔ اس لیے آج اسی جذبے، جوش اور انقلاب کے لیے راستہ ہموار کرنے کی ضرورت ہے جس کی شروعات سجاد ظہیر نے کی تھی۔

ترقی پسند تحریک کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ 1936 میں جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی

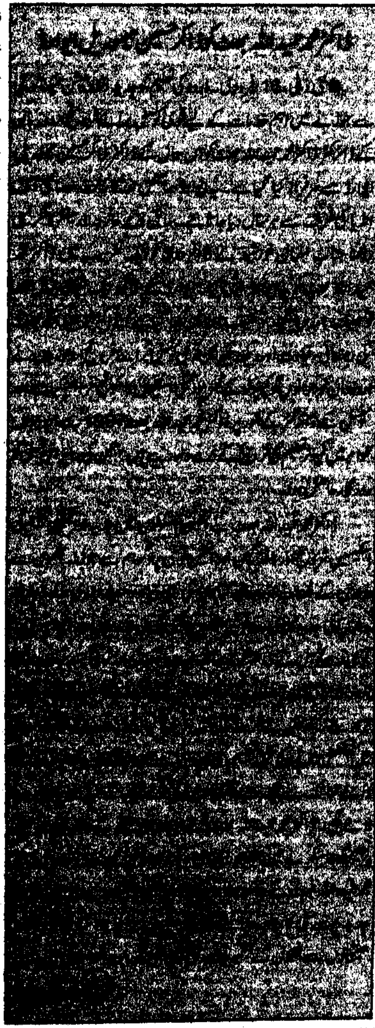

تو وہ ملک کی جنگ آزادی کا ایک نازک موڑ تھا لیکن گاندھی جی اور دیگر قومی رہنماؤں کی قیادت میں آزادی کی جنگ لڑ کر ہم نے اس دور سے نجات حاصل کی۔ انگریزوں نے جاتے جاتے ملک میں فرقہ واریت کا ایسا بیج بو دیا جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ کی خلیج بڑھتی گئی۔ آج بھی ملک میں ایسی طاقتیں سرگرم ہیں جن کا آزادی کی جنگ میں تو کوئی رول نہیں رہا لیکن ملک میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کی کوششیں وہ ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں ان طاقتوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ سجاد ظہیر نے ملک کی آزادی کی لڑائی میں جس طرح نمایاں رول ادا کیا، آج آزادی کی حفاظت کے لیے بھی اسی جذبے اور جوش کی ضرورت ہے۔

اس سے قبل قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا تشخص اور ہماری پہچان ہماری مشترکہ تہذیب ہے۔ اس Composite Identity کے فروغ میں سجاد ظہیر اور ان کے رفقائے کار نے ایک کلیدی رول ادا کیا ہے۔ سیکولر پولیٹی کی تعمیر میں جناب ارجن سنگھ کا کمٹ منٹ واضح ہے۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ سجاد ظہیر اور جناب ارجن سنگھ کی پیدائش ایک ہی دن یعنی 5 نومبر کی ہے بلکہ اس میں قدرت کے واضح اشارات بھی ہیں۔ بزرگ رہنماؤں میں آج کے ہندستان میں جناب ارجن سنگھ کا وہی مرتبہ ہے جو ترقی پسند فکر میں سجاد ظہیر کا ہے۔ اس پس منظر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور انجمن ترقی پسند

مصنفین نے مشترکہ طور پر طے کیا کہ سجاد ظہیر صد سالہ تقریبات کا انعقاد سارے ملک میں کیا جائے۔ قومی سطح کا یہ سمینار اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ اس سمینار میں اس بات پر بھی غور کیا جائے گا کہ 21ویں صدی کے ابھرتے منظرنامے میں ہماری مشترکہ تہذیب کیسے ارتقاپذیر ہوگی۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب سدیپ بنرجی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ سجاد ظہیر اپنے آپ میں ایک تحریک تھے۔ آج ملک میں بہت سارے لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ سجاد ظہیر نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی ہندستان کی تاریخ سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ اس لیے آج ہماری نئی نسل کو سجاد ظہیر اور ترقی پسند تحریک کے نمایاں رول سے واقف کرانے کی ضرورت ہے۔

سجاد ظہیر کی صاحب زادی محترمہ نادرہ ببر نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اپنے اصولوں پر قائم رہنے اور اپنی زندگی کو کسی مقصد کے تئیں وقف کرنے کے کیا معنی ہیں، یہ ہم نے سجاد ظہیر سے سیکھا۔ میں کونسل کو اس بات کے لیے مبارکباد پیش کرتی ہوں کہ اس نے وقت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے سجاد ظہیر صدی تقریبات کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ہندستانی مشترکہ کلچر کی تعمیر میں سجاد ظہیر اور ترقی پسند تحریک کے رول پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سجاد ظہیر ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے گذشتہ صدی میں آنے والی صدی کے لیے راستہ ہموار کیا۔ انھوں نے ایک ایسے سماجی نظام کا خواب دیکھا جس میں استحصال نہ ہو، مساوات، امن اور سیکولرزم ہو۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ سجاد ظہیر بیسویں صدی کے قدآور دانشوروں اور ادیبوں کی صف میں بے حد نمایاں ہیں۔ انھوں نے محنت کش طبقوں کو ان کے حقوق کے تئیں بیدار کرنے اور انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سجاد ظہیر کے ساتھی جناب اے کے ہنگل نے اپنی صدارتی تقریر میں انھیں تہذیبی رہنما قرار دیتے ہوئے کہا کہ سجاد ظہیر بڑے اچھے کامریڈ، انسان اور مصنف تھے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ سجاد ظہیر نے جن خوابوں کی تعبیر کے لیے جدوجہد کی، اسے سنجیدگی سے جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔

سمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں جس کا عنوان ''سجاد ظہیر: ہندستان میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے معمار'' تھا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد عقیل نے کہا کہ سجاد ظہیر محض ایک شخص ہی نہیں، ایک تحریک تھے۔ انھوں نے جس صنف ادب پر بھی قلم اٹھایا اس میں انھیں ہراول کی حیثیت حاصل رہی۔ ''روشنائی'' میری نظر میں ان کی سب سے اہم تحریر ہے۔ یہ ترقی پسند تحریک کا رپورتاژ بھی ہے اور دستور العمل بھی۔'' اپنے خطبے میں پروفیسر عقیل نے سجاد ظہیر کی تمام کتابوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ بعدازاں پروفیسر فضل امام، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر شفیع شوق، جناب منظر شہاب، محترمہ ترنم ریاض، ڈاکٹر نسرین بیگم، محترمہ نگار عظیم، جناب امجد جاوید، جناب اے کے ہنگل، جناب رفعت سروش، جناب کمال احمد صدیقی، جناب ممتاز انور، ڈاکٹر شکیل صدیقی، پروفیسر عبدالودود اظہر، پروفیسر شارب ردولوی، جناب بلراج پوری اور پروفیسر قمر رئیس نے مباحثے میں حصہ لیا۔ اس اجلاس کی صدارت ممتاز افسانہ نگار جناب رتن سنگھ، جناب تقی حیدر اور پروفیسر محمد حسن نے کی۔ نظامت پروفیسر نصیر احمد خاں نے کی۔

سمینار کے دوسرے اجلاس کا موضوع ''اردو ادب میں ترقی پسند ادیبوں کی خدمات'' تھا جس کی مجلس صدارت میں جناب یوسف ٹینگ، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر ظہورالدین اور جناب زبیر رضوی شامل تھے۔ نظامت ڈاکٹر خلیق انجم نے کی۔ ''اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی خدمات'' کے موضوع پر پروفیسر علی احمد فاطمی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسند تحریک بیسویں صدی میں زبان و ادب کی سب سے بڑی تحریک ہے۔ اس تحریک نے ہندستان کی تمام زبانوں کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا اور مذہبی اور طبقاتی منافرت کو ختم کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔ اس نے ادبی، لسانی اور جغرافیائی تفریق کی حدیں توڑیں اور ادب میں عوامی مسائل کو پیش کیا۔ اس اجلاس میں محترمہ ترنم ریاض نے ''اردو ادیبائیں اور ترقی پسند تحریک'' محترمہ نگار عظیم نے ''ترقی پسند تحریک اور تانیثی ادب'' ڈاکٹر نسرین بیگم نے ''رشید جہاں اور انگارے بجھے نہیں'' محترمہ ثروت النسا نے ''رشید جہاں کی ترقی پسند فکر اور تانیثی افسانہ'' اور جناب شاہد احمد شعیب نے کیفی اعظمی پر مقالے پڑھے۔ بعدازاں مقالوں پر بحث کا آغاز ہوا جس میں پروفیسر فضل امام، جناب منظر شہاب، جناب شکیل صدیقی، جناب رفعت سروش، جناب اقبال مجید، محترمہ شہناز نبی، پروفیسر ریاض پنجابی اور ڈاکٹر علی جاوید نے حصہ لیا۔

اس اجلاس میں جناب یوسف ٹینگ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہر تحریک کے پیچھے ایک کارساز ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے کارساز تھے۔ انسان دوستی، انکسار، مقناطیسیت ان کی شخصیت کا جز تھیں۔ انھوں نے ہماری کلاسیکی اور جمالیاتی قدروں کو بحال کیا۔ ''ذکر حافظ'' اس کی روشن مثال ہے۔ پروفیسر ظہورالدین نے ترقی پسند تحریک کی لسانی خدمات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے صدارتی خطبے میں بدلے ہوئے حالات میں ترقی پسند تحریک کی سمت کا تعین کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ترقی پسند تحریک کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس تحریک نے دیگر زبانوں کے ادیبوں کے ساتھ مل بیٹھنے، ان سے تبادلۂ خیالات کرنے کا ایک نیا لسانی کلچر دیا۔ موجودہ ملکی پس منظر میں آج پھر اسی کلچر کو بحال کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے شکریے پر اس اجلاس کا خاتمہ ہوا۔

سمینار کے تیسرے اجلاس کا موضوع ''ترقی پسند فکر اور سیکولر جمہوری

روایات'' تھا جس میں پروفیسر امتیاز احمد نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سیکولرزم ہندستان کی عوامی وراثت ہے اور ترقی پسند تحریک نے اس کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج مذہب کی بنیاد پر انسان کو تقسیم کرنے والی قوتوں کو کاؤنٹر کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام ترقی پسند تحریک بخوبی کرسکتی ہے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر صادق، جناب بلراج پوری اور جناب جوگندر پال نے کی اور جناب شکیل صدیقی، جناب گوتم نولکھا، پروفیسر وشوناتھ ترپاٹھی، محترمہ شہناز نبی، جناب ساجد رشید، جناب اقبال مجید، پروفیسر فضل امام، پروفیسر ظہورالدین، جناب پیغام آفاقی اور محترمہ ثروت النسا نے بحث میں حصہ لیا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اس موقعے پر اعلان کیا کہ قومی اردو کونسل ترقی پسند تحریک سے متعلق تمام تحریروں کی اشاعت کے ذریعے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں حال ہی میں قائم کیے گئے پریم چند میوزیم (جس میں پریم چند کے علاوہ ترقی پسند تحریک سے متعلق کتابیں، دستاویزات، تصاویر اور دیگر چیزیں جمع کی جائیں گی) کا دامن بھی وسیع کرے گی۔

سیمنار کے چوتھے اجلاس کا موضوع ''ترقی پسند تحریک کا ماس میڈیا پر اثر'' تھا جس میں جناب شمیم فیضی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے عوامی رائے عامہ ہموار کرنے میں ترقی پسند رسائل کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کی مجلس صدارت میں جناب سید محمد مہدی، جناب اقبال مجید، جناب زبیر رضوی اور جناب ایم بی نقوی تھے۔ جبکہ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، جناب رضا امام، پروفیسر محمد شاہد حسین، جناب جاوید نقوی، جناب رفعت سروش، پروفیسر ظہورالدین نے بحث میں حصہ لیا اور پروفیسر ریاض پنجابی نے جلسے کی نظامت کی۔

اس تین روزہ سیمنار کی اختتامی تقریب 6رفروری کی شام 5 بجے منعقد ہوئی جس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیرالحسن نے کی۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''ترقی پسند تحریک کو نئے عالمی تناظر کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنا منشور تیار کرنے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں مصنوعی دیواروں کو توڑ کر اجتماعی مسائل کے حل کے لیے آگے آنے کی ضرورت ہے۔'' انھوں نے مزید کہا کہ آج زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ترقی پسند تحریک کی خدمات اور موجودہ قومی اور بین الاقوامی صورتِ حال میں اس تحریک کے رول سے واقف کرانے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر انھوں نے یہ بھی کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سجاد ظہیر لیکچر سیریز بھی شروع کی جارہی ہے۔

قبل ازیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اختتامی تقریب کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ آج عالمی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں، ہندستان بھی ان سے متاثر ہو رہا ہے۔ اس لیے موجودہ منظرنامے میں ہمیں غور کرنا ہوگا کہ ترقی پسند تحریک کا بدلتے ہوئے عالمی ماحول کے ساتھ کیا مناظرہ ہوسکتا ہے۔

روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کے ایڈیٹر جناب عزیز برنی نے اختتامی جلسے میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسند ادیبوں کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اخبارات و رسائل کا بھرپور استعمال کرنا چاہیے اور فرقہ پرستی کے خلاف عوامی رائے عامہ ہموار کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

جناب یوسف ٹینگ نے کہا کہ اشتراکیت مظلوموں اور مجبوروں کی حمایت کا نام ہے۔ آج دنیا کے ہر حصے میں مظلوموں اور غریبوں کی حمایت اور ان کے حقوق کی آواز بائیں بازو کی طاقتیں ہی اٹھا رہی ہیں۔ قومی اردو کونسل کی کارگزاریوں کی ستائش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ گذشتہ سات برسوں میں کونسل اپنے منشور کے مطابق کام کرنے میں کامیاب رہی ہے اور اس نے نہ صرف اردو زبان وادب کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں بلکہ کمپیوٹر کے ذریعے اردو کو روزگار سے جوڑنے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے عصری تناظر میں ترقی پسند تحریک کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے نوجوان نسل کو اس کی باگ ڈور سنبھالنے کی دعوت دی۔ آخر میں پروفیسر قمر رئیس نے آخر میں تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

''زبان وادب کی تفہیم وتدریس'' پر مذاکرہ

● ممبئی، 2رجنوری۔ ''اردو زبان وادب کی تفہیم وتدریس کے مسائل اور طریقۂ کار'' کے زیرِعنوان شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی اور اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ نے مشترکہ طور پر ممبئی یونیورسٹی میں تین روزہ قومی سیمنار منعقد کیا جس کا افتتاح 2رجنوری کو جے پی نائک بھون، ممبئی یونیورسٹی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر جناب فخرالدین خوراکی والا نے کیا جبکہ وزیرِمحنت، حکومتِ مہاراشٹر جناب نواب ملک نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر ابھے پیٹھے نے اجلاس کی صدارت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر عبدالستار دلوی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایک زبان بول چال میں استعمال ہوتی ہے اور ایک علم وادب کے لیے۔ علم وادب کی زبان ہی درس وتدریس میں استعمال ہوتی ہے اور یہیں سے اس کی تفہیم کے مسائل شروع ہوتے ہیں۔ انھوں نے دوسری زبانوں کے الفاظ کو اردو میں شامل کیے جانے کی وکالت کی۔ پروفیسر نورالعین علی نے کہا کہ استاد کو چاہیے کہ طالب علم اپنے گھر اور محلے سے جو غلط اور ناموزوں الفاظ وتراکیب سیکھ کر آیا ہے، اس کی اصلاح کرے اور پھر صحیح زبان سکھائے۔ انھوں نے طلبہ میں مستند لغت دیکھنے کی عادت ڈالنے، ذوقِ صحیح کی تربیت اور نصاب کے معیار کو کم کرنے کی بجائے طریقۂ تدریس میں جدت لانے پر زور دیا۔ حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی کے ڈاکٹر مظفر شہ میری نے کہا کہ ہر استاد بنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہوتا ہے اگر وہ شعوری طور پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے تو بہتر استاد بن سکتا ہے۔ قبل ازیں ڈاکٹر معین الدین جینابڑے

نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔

پہلے اجلاس میں ڈاکٹر مسرت فردوس نے مہاراشٹر کے حوالے سے، ڈاکٹر شہناز نبی نے مغربی بنگال کے حوالے سے، پروفیسر سجاد حسین نے تمل ناڈو کے حوالے سے اور پروفیسر م.ن.سعید نے کرناٹک کے حوالے سے مقالے پیش کیے۔ صدارت پروفیسر بیگ احساس نے کی۔ دوسرا اجلاس دکنیات کے لیے مخصوص تھا جو پروفیسر م.ن.سعید کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کے ڈاکٹر مجید بیدار نے دکنی نثر اور ڈاکٹر فاطمہ بیگم نے دکنی قصائد کی تفہیم وتدریس پر مقالے پیش کیے جبکہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے دکنی کی تدریس کے مسائل وطریقۂ کار کا عمومی جائزہ پیش کیا۔

دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر حمید سہروردی اور نظامت شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی کے ڈاکٹر صاحب علی نے کی۔ اس میں ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے امدادی افعال کی تدریس کے مسائل، ڈاکٹر معین الدین جینابڑے نے ترجے اور پروفیسر بیگ احساس نے جدید ادب کی تدریس کے مسائل پر مقالے پیش کیے۔ اس کے بعد مدراس یونیورسٹی کے پروفیسر سجاد حسین کے زیرِ صدارت منعقدہ اجلاس میں ڈاکٹر زبیدہ بیگم نے معاصر افسانے کی تفہیم وتدریس، ڈاکٹر اقبال النسا بیگم نے افسانے کی تدریس، جناب ظہیر انور نے اردو ڈرامے کی روایتی تفہیم وتدریس اور ڈاکٹر حمید سہروردی نے تجریدی افسانے کی تدریس پر مقالے پیش کیے۔ تیسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کی جس میں ڈاکٹر صاحب علی نے اردو قصیدے، جناب سلیم شہزاد نے اصطلاحات اور ڈاکٹر محمد ظفر الدین نے ترجمہ دابلاغیات کے حوالے سے مقالات پیش کیے جبکہ پروفیسر شوکت حیات نے اپنے مقالے میں اوپن یونیورسٹی اور فاصلاتی نظامِ تعلیم میں اردو کی صورتِ حال اور امکانات پر اظہارِ خیال کیا۔ اس کے بعد کا اجلاس پروفیسر شوکت حیات کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں جناب غلام نبی مومن نے تدریسِ زبان اور نصاب کی تدوین، ڈاکٹر افسر فاروقی نے نصاب سازی: ایک عمل اور تجزیہ، ڈاکٹر مسرت جہاں نے نظم کی تدریس اور پروفیسر میمونہ دلوی نے عوامی ادب کی تدریس پر اپنے مقالات پیش کیے۔ سمینار کا آخری اجلاس پروفیسر میمونہ دلوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر محمد حسن فاروقی، ڈاکٹر عبدالمناف اور ڈاکٹر منزہ قاضی نے مقالات پیش کیے۔

سمینار کے اختتامی اجلاس میں دانشوروں نے اس پہلو پر غور کیا کہ کسی بھی سمینار کو کیسا ہونا چاہیے؟ اس کے انعقاد کا مقصد کیا ہے؟ سمینار سے اساتذہ، طلبہ اور اسکالروں کو کیا فائدہ ہے؟ اس میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اور ڈاکٹر مہاراج کول نے اظہارِ خیال کیا۔ آخر میں ڈاکٹر معین الدین جینابڑے نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

''اردو تعلیم: مشکلات اور تدارک'' پر مذاکرہ

● نئی دہلی، 25 رجنوری۔ اردو زبان وتعلیم کی ترقی، فروغ اور نفاذ کے سلسلے میں رکاوٹوں نیز اردو اسکولوں واساتذہ کی کمی، نصابی کتابوں کی وقت پر فراہمی اور سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو تعلیم کا نظم نہ ہونے جیسے مختلف مسائل کو بڑے پیمانے پر عوامی تحریک کے ذریعے ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ایسوسی ایشن فار پروموشن آف لینگویجز اینڈ ایجوکیشن کی جانب سے اردو گھر میں منعقدہ سمینار میں مقررین نے کیا۔ سمینار میں ابتدائی اور ثانوی سطح پر اردو تعلیم کے مسائل اور حل کے ممکنہ اقدامات پر غور وخوض کیا گیا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے جلسے میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ نئے عالمی منظرنامے میں اردو کن خطوط پر آگے بڑھے گی اور اردو بحیثیت میڈیم، کی افادیت اور اہمیت کے کیا امکانات ہیں۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اردو زبان وتعلیم کے اہم مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اسکولوں میں ضرورت سے بہت کم اردو اساتذہ ہیں۔ اردو کی نصابی کتابیں وقت پر اسکولوں کو فراہم نہیں ہو پاتیں اور سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو تعلیم کا انتظام نہیں ہو پاتا۔ مسٹر شمیم فیضی نے کہا کہ ہمارے یہاں دو طرح کے اسکول ہیں، ایک اردو میڈیم اسکول ہیں جہاں تمام مضامین کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اور دوسرے وہ اسکول ہیں جہاں اردو بحیثیت ایک مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ ہمارا دستوری حق ہے کہ ہم اپنے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دلائیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اردو تعلیم کے مختلف مسائل اور ان کے حل کے ممکنہ اقدامات پر روشنی ڈالی اور اسکولوں کو وقت پر نصابی کتابیں فراہم کرانے پر زور دیا۔ جلسے میں مسٹر م. افضل، مسٹر بشیر احمد، مسٹر فرید احمد، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد معروف، مسٹر اظہار اثر، محترمہ وسیم راشد اور ڈاکٹر اللہ مہر نے بھی اردو زبان وتعلیم کے مختلف مسائل ومشکلات پر روشنی ڈالی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''علامہ اقبال: فن اور شخصیت'' سیمنار

● حیدرآباد، 29 رجنوری۔ ''علامہ اقبال کے فن اور ان کی شخصیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی اردو شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کو سمجھا جائے۔'' ان خیالات کا اظہار مقررین نے اردو ہال، حمایت نگر میں ''علامہ اقبال: فن اور شخصیت'' کے موضوع پر انجمن ترقی اردو ہند اور انجمن ترقی اردو (آندھرا پردیش) کی طرف سے منعقدہ دو روزہ سمینار کی افتتاحی تقریب میں

کیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صدر انجمن ترقی اردو (ہند) نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اقبال کی اردو شاعری کے بارے میں ہر کوئی واقف ہے اور اس پر اعتراضات بھی کیے گئے لیکن فارسی شاعری پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کی فارسی شاعری کا ترجمہ کیا جائے اور اس سے نئی نسل کو واقف کرایا جائے۔ اس پر شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کو توجہ دینی چاہیے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اقبال کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی اردو شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری اور نثری تحریروں کو سمجھا جائے۔ اقبال نے بیسویں صدی کے مجموعی ماحول اور جدید سائنس و ٹیکنالوجی کے سائے میں پنپنے والی تہذیب کے پیدا کردہ مسائل پر ایک مستقبل بیں مفکر کی حیثیت سے نظر ڈالی۔ ڈاکٹر ایم اے منان صدر انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ حیدرآباد شروع ہی سے اقبال شناسوں کا مرکز رہا ہے۔ سمینار کی افتتاحی تقریب سے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور سید شریف الحسن نقوی نے بھی خطاب کیا۔ جناب رحمٰن جامی نے کلام اقبال پیش کیا۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے اجلاس کی کارروائی چلائی اور پروفیسر آفاق احمد نے شکریہ ادا کیا۔ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) جناب خلیق انجم نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

(منصف، حیدرآباد)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں فراق میموریل لیکچر

● نئی دہلی، 13 رجنوری۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے چھٹے فراق میموریل خطبے کا انعقاد جامعہ گیسٹ ہاؤس کے کمیٹی روم میں کیا گیا جس کی صدارت وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کی۔ خطبے کا موضوع روایتی تصوف کی روشنی میں اسلام مذہب کے بارے میں تنقید تھا۔ اس موقعے پر جرمنی کی ارفرٹ یونیورسٹی کے شعبہ مذہبیات اور اسلامیات کے صدر پروفیسر جمال ملک نے احمد ندیم قاسمی کی کہانی ''بین'' کے خصوصی حوالے سے مسلم صوفیوں اور بزرگوں کے مزارات پر ہونے والے ان اعمال کا تجزیہ پیش کیا جو لوگوں کو آفات و مصائب سے نجات دلانے کے نام پر انجام دیے جاتے ہیں۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے فراق میموریل لیکچر میں قومی اردو کونسل کے اشتراک پر خوشی کا اظہار کیا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر احمد محفوظ نے یادگاری خطبے کی مناسبت سے اردو شاعری میں فراق کے مقام و حیثیت کے موضوع پر ایک مختصر مضمون پیش کیا، جس میں انھوں نے میر، فراق اور ناصر کاظمی تک شاعری کے ایک اہم اور موثر لہجے کے تسلسل کی نشاندہی کی۔ ڈاکٹر شہپر رسول نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس پروگرام میں خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر الطاف اعظمی، پروفیسر عتیق اللہ، شجاع خاور، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر تقی حسین جعفری، پروفیسر عنایت زیدی، پروفیسر سینا زیدی، پروفیسر قمر غفار، سجاد احمد، فرحت احساس اور ڈاکٹر جی آر سید وغیرہ نے شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

''خواجہ حسن نظامی اور نثار احمد فاروقی'' پر سمینار

● نئی دہلی، 28 رجنوری۔ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام سالانہ عرس کے موقعے پر ایک سمینار منعقد کیا گیا جس میں مقررین نے خواجہ حسن نظامی اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کی حیات، شخصیت اور خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر سید فاروق نے شرکت کی۔ دیگر شرکا میں پروفیسر تقی حسین جعفری، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر شریف احمد، ڈاکٹر مظہر امام، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر رضی کمال، خواجہ حسن ثانی نظامی، خواجہ سید محمد نظامی، خواجہ نوید پاشا نظامی، رفعت سروش، متین امروہوی، افضل منگلوری، ماجد دیوبندی وغیرہ شامل تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو اسکولوں کے مسائل پر ورکشاپ

● نئی دہلی، 4 رجنوری۔ اردو اکادمی کے زیر اہتمام اردو اسکولوں کے مسائل پر منعقدہ دو روزہ ورکشاپ میں اردو اساتذہ نے ان احساسات کا اظہار کیا کہ اردو کی بقا کے لیے اردو میڈیم اسکولوں کا قائم رہنا ضروری ہے۔ مباحثے میں یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ اساتذہ کی کمی اور نصابی کتابوں کا فقدان اردو اسکولوں کے اہم مسائل ہیں۔ ورکشاپ کے آخری اجلاس میں کوآرڈینیٹر پروفیسر احرار حسین نے اردو اسکولوں کے مسائل اور ان کے حل پر دو دن چلنے والی گفتگو کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اردو اکادمی، دہلی کے ذریعے اردو اسکولوں کو اِن سروس ایجوکیشن پروگرام کے تحت انفارمیشن ٹیکنالوجی سے آراستہ کرنے اور اردو میڈیم اسکولوں کے لیے خصوصی کوچنگ کا بندوبست کیا جائے۔ انھوں نے اردو اساتذہ کی تقرری اور نصاب کی تیاری کے لیے باصلاحیت افراد پر مشتمل ٹرانسلیٹر بینک کے قیام کو یقینی بنانے کا مطالبہ بھی کیا۔ اختتامی اجلاس کی صدارت اردو اکادمی کے وائس چیئرمین م۔ افضل، پروفیسر ظفر احمد نظامی اور سید محمود حیدر نقوی نے کی۔

اس موقعے پر مہمان خصوصی زبیدہ حبیب نے کہا کہ اس پروفیشن میں انھی لوگوں کو داخل ہونا چاہیے جو اس میں آنے والی دشواریوں کا مقابلہ کرسکیں تبھی وہ اپنی ذمے داریوں کا حق ادا کرسکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ استاد کو ایک اچھا شخص بھی ہونا چاہیے۔ اختتامی اجلاس کی نظامت مرغوب حیدر عابدی نے کی۔

ورکشاپ کے دوسرے روز کے پہلے اجلاس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ایم عرفان نے امتحانات کے انتظامات، پرچے بنانا، جانچنا اور نتائج کے موضوع پر تقریر کی۔ انھوں نے نئے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر تدریس اور اندازِ قدر وغیرہ کے موجودہ طریقوں کو تبدیل کیے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ دوسرے اجلاس میں بچوں کی نفسیات میں نئے رجحانات پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فیکلٹی آف ایجوکیشن کی پروفیسر پی کول نے تقریر کی۔ بعد ازاں اردو اکادمی، دہلی کی تعلیمی سب کمیٹی کے رکن پروفیسر محمد شاہد حسین اور محمد یوسف کی صدارت میں مباحثے کا اہتمام کیا گیا جس میں اساتذہ نے اپنے اپنے مسائل اور تجربات پیش کیے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

''سلام بن رزاق کی افسانہ نگاری'' پر مذاکرہ

● پٹنہ۔ ممتاز افسانہ نگار سلام بن رزاق کو ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازے جانے کی خوشی میں عظیم آباد کے تعلیمی ادارے ''پرفارمنس'' کی طرف سے ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جناب شوکت حیات نے کی۔ اس موقعے پر کالج آف کامرس کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر صفدر امام قادری نے کہا کہ غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش اور اقبال مجید کی نسل کے بعد جو افسانہ نگار سامنے آئے ان پر علامت اور تجرید کے اثرات نمایاں تھے لیکن جن لوگوں نے محتاط رویہ اپنایا اور سلجھے ہوئے انداز میں افسانے لکھے ان میں سلام بن رزاق کی شخصیت سب سے معتبر ہے۔ ''کام دھینو''، ''ندی''، ''ننگی دوپہر کا سپاہی''، اور ''خصی'' وغیرہ افسانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب قادری نے انھیں ستر کی نسل کا نمائندہ فن کار قرار دیا۔ جناب خورشید اکبر، جناب واحد نظیر، جناب منی بھوشن کمار، محترمہ علینہ علی ملک نے ''آندھی میں چراغ''، ''بنارسی ساڑھی''، ''آواز گریہ'' اور ''شکستہ بتوں کے درمیاں'' کو اردو افسانے کا ایک اہم موڑ قرار دیا۔ جناب آصف ابرار اور محترمہ ترنم جہاں نے بھی سلام بن رزاق کی افسانہ نگاری پر تفصیلی گفتگو کی۔

سلام بن رزاق کے ایوارڈ یافتہ مجموعے ''شکستہ بتوں کے درمیاں'' میں اندیشہ، آواز گریہ، آندھی میں چراغ، شکستہ بتوں کے درمیان، باہم، چادر، دوسرا قتل، ہدف، ابراہیم سقہ، خبر، بنارسی، ایک خیالی کہانی، موتی، زمین، چہرہ اور روزگار کل سولہ کہانیاں شامل ہیں۔

(ڈاک سے)

جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں اردو ریسرچ اسکالرز سمینار

● نئی دہلی، 16 رجنوری۔ ''افسانے کی پہلی اپیل قصے کی دلچسپی میں ہوتی ہے۔ اگر پہلی اپیل ہی نہ ہو سکے تو فن پارہ قاری کے دل و دماغ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ ترسیل کا المیہ اور ابلاغ کا فقدان ہے، جس میں آج کا اردو افسانہ بری طرح مبتلا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر موہن کنول نے مرکز برائے زبان و ادب اور کلچر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے کمیٹی روم میں اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کی جانب سے جدید اردو افسانے پر منعقدہ ایک روزہ سمینار کے صدارتی کلمات میں کیا۔ سمینار کی صدارت پروفیسر محمد شاہد حسین، ڈاکٹر انور پاشا اور ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کی۔ ایسوسی ایشن کی صدر شبانہ نے اساتذہ اور حاضرین کا استقبال کیا، کنوینر جلیس احمد نے ایسوسی ایشن کے عہدہ داران اور ارکان کا تعارف کرایا اور جنرل سکریٹری محمد اکمل شاداب نے اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ نظامت تنظیم کے جوائنٹ سکریٹری عبدالرب نے کی۔ اکبر یحییٰ اور عصمت پروین نے افسانے سنائے، تنویر احمد نے ''جدید اردو افسانے کے مسائل'' اور سرفراز احمد نے انتظار حسین کے افسانے ''ٹھنڈی آگ'' کا نفسیاتی مطالعہ'' کے زیرِ عنوان مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر انور پاشا نے جدید افسانہ نگاری کے آغاز و ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پروفیسر محمد شاہد حسین نے مقالہ خوانی کے آداب اور اصولوں کی طرف توجہ دلائی۔ سمینار میں ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر اشفاق احمد، ڈاکٹر رضوان الحق اور ڈاکٹر محمد اسلام کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مختلف شعبوں کے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات شریک ہوئے۔

(قومی آواز، دہلی)

''جاپان میں اردو'' پر سمینار

● نئی دہلی، 3 رفروری۔ ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ''جاپان میں اردو'' کے موضوع پر منعقدہ ایک مذاکرے میں صدر ساہتیہ اکادمی پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جاپانی دانشوروں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ جاپان میں اردو تعلیم کی روایت بہت پرانی ہے اور ادھر اس کی رفتار میں اضافہ ہوا ہے۔ اب اردو ٹوکیو یونیورسٹی کے علاوہ اوساکا یونیورسٹی میں بھی پڑھائی جا رہی ہے۔ وہاں نہ صرف ولی اور میر کے جاپانی تراجم ہو رہے ہیں بلکہ مثنوی میر حسن اور امراؤ جان ادا بھی نصاب میں پڑھائی جا رہی ہیں۔ صرف اوساکا یونیورسٹی میں 80 اردو طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ جاپان ہندستان اور پاکستان سے اپنے ثقافتی اور تہذیبی رشتوں کو مزید بہتر بنانا چاہتا ہے۔ خاص طور سے بدھ کی تعلیمات کو وہاں نہایت ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اوساکا یونیورسٹی، جاپان سے آئے پروفیسر تبسم کاشمیری نے جاپان میں اردو تعلیم اور اردو کی دیگر سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ جاپان اب اردو کا اہم ترین مرکز بن چکا ہے۔ گزشتہ 70 برسوں سے اردو شعر و ادب کے ترجمے کا سلسلہ جاری ہے۔ یہاں میر کی ڈھائی سو غزلوں کے علاوہ فیض اور اقبال کے کلام کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر اور خدیجہ مستور وغیرہ کی تحریروں کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ کچھ فلموں کے متن

بھی شائع ہوئے ہیں۔

پروفیسر سویاما نے ہندی ادب کی تاریخ اور اردو کی تعلیم کے ارتقا پر تنقیدی و تحقیقی مقالات کا ایک جائزہ پیش کیا اور بتایا کہ جاپانیوں کو اردو افسانہ اور شاعری بہت پسند ہے۔ روسا کا یونیورسٹی کے ہی پروفیسر ماتسو مورا نے کہا کہ ٹوکیو یونیورسٹی میں گزشتہ 15 برسوں سے اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ روسا کا یونیورسٹی میں بھی 80 برسوں سے اردو میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منشی پریم چند میوزیم کا قیام

● نئی دہلی، 27 رجنوری۔ منشی پریم چند نے مشہور و معروف کہانی ''کفن'' جامعہ ملیہ اسلامیہ کے احاطے میں بیٹھ کر لکھی تھی جو سب سے پہلے رسالہ ''جامعہ'' میں شائع ہوئی تھی۔ منشی پریم چند نے ہندی اور اردو دونوں ہی زبانوں میں اپنی تخلیقات قلم بند کیں۔ کبھی دھنپت رائے تو کبھی نواب رائے کے نام سے وقتاً فوقتاً اس دور کے رسائل اور ماہ ناموں میں ان کی کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کے مطابق جامعہ ملیہ اسلامیہ نے حکومت ہند کی وزارت ثقافت کو اس سلسلے میں ایک تجویز بھیجی ہے۔ اس تجویز میں جامعہ میں پریم چند آرکائیو اینڈ لٹریری سوسائٹی نامی ایک سینٹر کے قیام کی سفارش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پریم چند کی ہندی اور اردو تخلیقات کو دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کا کام بھی چل رہا ہے۔ جامعہ کے میڈیا کو آرڈینیٹر کے مطابق جامعہ کے شعبۂ انگریزی میں فی الحال منشی پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا کام جاری ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اتر پردیش اردو اکادمی کی تشکیلِ نو

● لکھنؤ، 11 رفروری۔ اتر پردیش کے گورنر نے اردو اکادمی کی تشکیلِ نو کرتے ہوئے معروف شاعر اور آل انڈیا اردو رابطہ کمیٹی کے صدر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کو اکادمی کا چیئر مین نامزد کیا ہے۔ سرکار کی طرف سے جاری نوٹیفکیشن کے مطابق مولانا محمد یاسین عثمانی (بدایوں)، شگفتہ خاں (سہارنپور)، ہمایوں قدیر (مرادآباد)، آفتاب حیدر (اناؤ)، سلمان خاں (اعظم گڑھ)، بابو وقار انصاری (میرٹھ)، عمران قریشی (میرٹھ)، عابد خاں (بریلی)، نفیس الحق (امبیڈکر نگر) اور ندیم حیدر کو اکادمی کا رکن نامزد کیا گیا ہے۔

اکیڈمی کی ورکنگ کمیٹی کے عہدے داروں میں لینگویج، فنانس اور ایجوکیشن کے پرنسپل سکریٹریز کے علاوہ گورکھپور یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدور شامل ہیں۔ اردو ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ کے ڈائرکٹر اور نائب چیئر مین بھی اس کے ممبر ہوں گے۔ اس کے علاوہ ورکنگ کمیٹی کے لیے ندیم حیدر ایڈووکیٹ (اناؤ) ہمایوں قادر (مرادآباد) عبدالسلام صدیقی (امبیڈکر نگر) شکیل احمد ہلو (وارانسی) غلام محمد (میرٹھ) عبید الحق (رامپور) اور بہت سے دیگر افراد کو نامزد کیا گیا ہے۔ (یو۔این۔آئی)

اردو یونیورسٹی میں ملٹی میڈیا سینٹر کا قیام جلد

● حیدرآباد، 19 رجنوری۔ ''مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں جلد ہی ایک عصری ملٹی میڈیا سینٹر کا قیام عمل میں آئے گا۔ اس میڈیا سینٹر میں عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ اردو نصاب کا الیکٹرانک مواد تیار کیا جائے گا۔ اردو ٹیچنگ اور ریسرچ سینٹر لکھنؤ کے زیر تربیت اساتذہ کے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے یہ یقین دلایا کہ 50 طلبہ کی فراہمی پر اردو یونیورسٹی آسام میں اسٹڈی سینٹر قائم کرے گی۔

اردو ٹیچنگ اور ریسرچ سینٹر کے زیر تربیت اردو اساتذہ کی (جن کی اپنی مادری زبان اردو نہیں) شعبۂ اردو میں آمد پر ایک استقبالیہ جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ پروفیسر خالد سعید صدر شعبۂ اردو نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر وہاب قیصر کنٹرولر آف ایگزامنیشن نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام و ترقی سے مہمانوں کو متعارف کرایا۔ ممتاز فکشن نگار جناب غضنفر، پرنسپل اردو ٹیچنگ اور ریسرچ سینٹر لکھنؤ نے اس موقعے پر اردو یونیورسٹی کے ارباب مقتدر کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ادارے کے اغراض و مقاصد میں اردو زبان کے فروغ و استحکام اور اس کی ترقی و ترویج کے علاوہ مختلف لسانی فرقوں میں یکجہتی کو فروغ دینا، اردو کے نصاب و تدریس کے طریقوں کو عصری اور سائنٹفک طریقوں سے ہم آہنگ کرنا، اساتذہ کی تربیت کے لیے ریفریشر کورسیز، اورینٹیشن کورسیز کا خود اہتمام کرنا یا اس معاملے میں دوسرے اداروں سے اشتراک کرنا اور لسانی و ادبی ورکشاپ کا اہتمام کرنا بھی شامل ہے۔ (ڈاک سے)

اصغر علی انجینئر کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری

● نئی دہلی، 14 رجنوری۔ ''صحت و تعلیم موجودہ قومی ترقی پسند اتحاد حکومت کے مشترکہ کم از کم پروگرام کی اہم ترجیحات میں شامل ہیں اور جامعہ ہمدرد ان شعبوں میں قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ترقی انسانی وسائل کے مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ نے جامعہ ہمدرد کے ساتویں جلسۂ تقسیم اسناد میں کیا۔ انھوں نے ڈگریاں حاصل کرنے والے طلبہ کو تلقین کی کہ وہ شمالی ریاستوں خصوصاً اتر پردیش اور بہار میں غریب بچوں میں تعلیم عام کرنے کے لیے کام کریں جہاں مسلمان بڑی تعداد میں ہیں۔ جلسۂ تقسیم اسناد میں مشہور و معروف دانشور اور مفکر ڈاکٹر اصغر علی انجینئر کو اعزازی طور پر ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری سے نوازا گیا جبکہ ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری مسٹر پی کے ویریار کو

انڈین سسٹم آف میڈیسن میں ان کی غیر معمولی خدمات کے صلے میں عطا کی گئی۔

امیر جامعہ جناب سید حامد نے جلسے کا باضابطہ آغاز کیا اور شیخ الجامعہ جناب سراج حسین نے مہمانِ خصوصی اور دیگر شرکا کا استقبال کرتے ہوئے یونیورسٹی کا تعارف پیش کیا۔ اس اجلاس میں پی ایچ ڈی کی 15، ایم ڈی کی 5، ایم اے کی 22 اور بیچلر کی 256 اسناد طلبہ کو تفویض کی گئیں۔ غیر معمولی تعلیمی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امتیازی نمبروں سے اول آنے والے طلبہ کو گولڈ میڈلس بھی دیے گئے جن کی تعداد 30 تھی۔ (قومی آواز، دہلی)

کمپیوٹر سینٹر کا جلسۂ تقسیمِ اسناد اور فنکشنل عربک کورس کی افتتاحی تقریب

● گلبرگہ، 6 فروری۔ 29 جنوری کو فاران ہائی اسکول، گلبرگہ میں جلسۂ تقسیم اسناد منعقد کیا گیا۔ اس کی صدارت جناب وہاب عندلیب سابق صدر کرناٹک اردو اکادمی نے کی۔ جناب خلیل مامون آئی جی پی (سرپرست اعلا آل انڈیا اردو منچ) محترمہ شائستہ یوسف خان آل انڈیا ریڈیو بنگلور اور پروفیسر ہاشم علی نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقعے پر جناب خلیل مامون نے اپنے خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ آج جس انداز سے شب و روز اردو کے فروغ اور نوجوانوں میں عصری تعلیم جیسے کمپیوٹر کی تعلیم کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں اسی طرح آج ہمارے ہر ذی علم اور دانشور کو کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے پورے ہندستان میں روزگار مرکوز کورسیز شروع کر کے ایک ایسا مستحسن کام کیا ہے جس کو قطعی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی دانشوری اور زبان و ادب اور قوم کی سچی خدمت ہے۔ اس موقع پر جناب خلیل مامون نے امجد جاوید چیف ٹرسٹی کی کاوشوں کی بھی ستائش کی اور تمام طلبہ و طالبات کو مبارکباد پیش کی۔ محترمہ شائستہ یوسف نے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ کمپیوٹر و سائنس کی تعلیم گھر گھر عام ہو۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ہم اپنے بچوں کو عصری تعلیم دلوائیں اور ان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کریں۔ محترمہ نے حلیمہ ٹرسٹ کے تحت عربی کورس کے افتتاح پر خوشی کا اظہار کیا۔ پروفیسر ہاشم علی نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔ جناب وہاب عندلیب نے اپنی تقریر میں خواندگی کا معیار بہتر بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے حلیمہ کمپیوٹر سینٹر کی کارکردگی کی ستائش کرتے ہوئے اس کی ترقی کی دعا کی اور فنکشنل عربک کورس کو نوجوانوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ قرار دیا۔

جناب خلیل مامون نے دو سالہ ڈپلوما ان فنکشنل عربک کورس کا افتتاح کیا۔ عالیہ نسرین نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور امجد جاوید کے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ 30 جنوری کو حیدرآباد کرناٹک چیمبر آف کامرس سوپر مارکیٹ میں ایک تہنیتی اجلاس، مذاکرہ اور شعری نشست کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت جناب وہاب عندلیب نے کی۔ جناب سید سمیع اللہ حسینی سپرو ائزر نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ جناب قمر الاسلام سابق وزیر محنت حکومت کرناٹک، جناب خلیل مامون، محترمہ شائستہ یوسف نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقعے پر ''اردو کی موجودہ صورتِ حال اور ہماری ذمے داریاں'' کے موضوع پر ایک مذاکرے کا انعقاد عمل میں آیا جس میں جناب قمر الاسلام نے قومی اردو کونسل کی طرف سے فروغِ اردو کے لیے کی جانے والی کوششوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ زبان و ادب اور عصری تعلیم کے فروغ کے لیے شبانہ روز مصروف ہیں۔ اس موقعے پر جناب خلیل مامون، جناب عبدالحمید، جناب محمود احمد اور محترمہ شائستہ یوسف نے بھی اردو کی موجودہ صورتِ حال پر روشنی ڈالی۔ بی بی رضا طالبہ ایم اے سالِ آخر نے مقالہ پیش کیا اور جناب امجد جاوید کے شکریے پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

'اردو رتن' ایوارڈ کا آغاز

● ممبئی: 12 جنوری۔ اردو زبان و ادب کی نمایاں ترین خدمت کے اعتراف میں عالمی اردو کانفرنس نے ہر سال دنیائے ادب کی کسی اہم شخصیت کو اردو رتن ایوارڈ سے سرفراز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجاہد اردو علی صدیقی مرحوم کے دو دہائی قبل قائم کردہ اس ادارے نے نئی نسل میں اردو زبان و ادب کا ذوق پیدا کرنے کے لیے یونیورسٹی سطح پر تحریری مقابلوں اور انعامات کے ذریعے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ صدر کانفرنس ارشد قادری کے مطابق اردو صحافت کے فروغ و احیا کے لیے ماحول سازی اور شہروں سے دیہات تک اردو کی سرگرمیاں وسیع کرنے کے اقدامات بھی کیے جائیں گے۔ ادارے کی طرف سے اپریل میں ایک سمینار بھی منعقد کیا جائے گا جس کا موضوع ہندستانی فلمی صنعت اور ٹیلی ویژن کے فروغ میں اردو کی اہمیت ہوگا۔ اس میں فلم اور ٹی وی سے وابستہ قلم کاروں، فلمسازوں، ہدایت کاروں، گلوکاروں، اداکاروں اور صحافیوں کو ایوارڈ دیے جائیں گے۔ عالمی اردو کانفرنس کا علمی، ادبی، تہذیبی و ثقافتی اجتماعات، مشاعرے اور تقریبات کا سلسلہ پھر سے شروع کرنے کا ارادہ بھی ہے۔ (سالار، بنگلور)

مختصرات

● کڈپہ، 16 جنوری۔ انجمن ترقی اردو ضلعی شاخ، کڈپہ کے زیر اہتمام کڈپہ، کرنول، اننت پور، چتور، نیلور اور پرکاشم اضلاع پر مشتمل دو روزہ زونل اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت مولانا سید شاہ مصطفیٰ حسین بخاری، صدر انجمن ترقی اردو، کڈپہ نے کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کڈپہ میں

اردو کے آغاز وارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ مہمانِ خصوصی جناب ایم اے غفور، رکنِ اسمبلی، کرنول نے اردو زبان، اردو اساتذہ اور اردو مدارس کے مسائل کے حل کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنے کا مشورہ دیا اور اساتذہ کے ترجیحی ادارے ڈائیٹ میں لکچرارس کی اسامیوں کی منظوری وتقرر کا مطالبہ کیا۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کہا کہ انجمن ترقی اردو (کڈپہ) اردو زبان کی ترقی کے لیے محنت اور ایمانداری سے کام کررہی ہے۔ اس اجلاس میں جناب وی ایس امیر بابو، جناب ٹی کے افضل خاں، جناب کے ایس برکت اللہ نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ نظامت شیخ عبدالستار فیضی نائب صدر انجمن ترقی اردو، کڈپہ اور سید شکیل احمد شکیل شریک معتمد، انجمن ترقی اردو، کڈپہ نے کی۔ کنوینر سید ہدایت اللہ معتمد عمومی تھے۔ جلسے میں سووینیر کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ (ڈاک سے)

● جلگاؤں۔ معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر محبوب راہی کے اعزاز میں جلگاؤں اردو رائٹرز فورم نے ایک جلسے کا انعقاد کیا جس کی صدارت سابق کونسلر جناب مبین احمد نے کی۔ رائٹرز فورم کے صدر جناب معین الدین عثمانی نے ڈاکٹر محبوب راہی کا تعارف کراتے ہوئے ان کے تعلیمی اور ادبی سفر کا تفصیلی خاکہ پیش کیا۔ اس موقعے پر جناب صابر امدادی اور قیوم اثر نے اپنے کلام سے نوازا۔ جناب عبدالمناف رضوی، پروفیسر یونس، سہیل اختر رحمانی اور رشید بھائی نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے اپنی تقریر میں اردو رائٹرز فورم کا شکریہ ادا کیا۔ اس خصوصی نشست کی نظامت جناب وحید امام نے انجام دی اور رسمِ شکریہ صغیر احمد نے ادا کی۔ (ڈاک سے)

● احمد آباد۔ مشہور نقاد پروفیسر وارث علوی کو غالب انسٹی ٹیوٹ (دہلی) کی جانب سے ''غالب ایوارڈ برائے 2004'' دیے جانے کی خوشی میں احمد آباد کی مختلف ادبی اور تعلیمی انجمنوں نے انھیں استقبالیہ دیا۔ باپونگر میں پروفیسر وارث علوی کی گراں قدر ادبی وتنقیدی خدمات کے اعتراف میں ایک اردو ہندی مشاعرے کا انعقاد بھی کیا گیا۔ اس موقعے پر انجمنِ اسلام ہائی اسکول (احمد آباد) جہاں سے وارث علوی نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا، میں ایک اعزازی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ پروفیسر وارث علوی نے مذکورہ اسکول کے طالب علم اور مدرس کی حیثیت سے اپنے تاثرات پیش کیے اور طلبہ کو ادبی مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کی تلقین کی۔ اس موقعے پر ان کی کتابوں کے سرورق کی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔
(ڈاک سے)

● نئی دہلی، 28 رجنوری۔ سپریم کورٹ کے کمیٹی روم میں اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ کے اساتذہ کی دہلی آمد پر ایک خصوصی جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں نامور ناول نگار جناب پیغام آفاقی اور سپریم کورٹ کے سینئر وکیل جناب مشتاق احمد نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر کے پرنسپل ڈاکٹر غضنفر نے مہمانوں کا استقبال کیا اور سینٹر کا تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر پیغام آفاقی نے مرکزی سرکار کے اس اقدام کی ستائش کی کہ اردو کلچر اور تہذیب کے مراکز سے ان اساتذہ کا براہِ راست تعارف کرایا جارہا ہے۔ جناب مشتاق احمد نے کہا کہ اردو کے ارتقا میں تمام مذاہب کے لوگوں کا حصہ رہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان اپنی داخلی قوت کی وجہ سے زندہ ہے۔ اس وفد میں منی پور، اڑیسہ، آسام اور اترپردیش کے اساتذہ شامل تھے۔ آخر میں ٹور کے انچارج ڈاکٹر ابوارشد نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● کشن گنج۔ قدیم، دینی، ملی اور تعلیمی ادارے انجمن اسلامیہ نے اپنے جشنِ سالانہ کے موقعے پر سیمنار اور مشاعرے کا انعقاد کیا۔ اس پروگرام میں مرکزی وزیرِ مملکت محمد تسلیم الدین مہمانِ خصوصی تھے۔ انجمن اسلامیہ کے صدر محمد نجم الدین سابق ایم ایل اے اور سکریٹری اختر الایمان ضلع پارشد بھی موجود تھے۔ اس تقریب میں اہم شخصیات کو امتیازی نشان اور توصیفی سند سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر ممتاز صحافی اخبار ''ہمارا پرچم'' کے چیف ایڈیٹر شمیم ربانی کو اردو صحافت میں گرانقدر خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ گذشتہ 35 برسوں سے مسلسل یہ پندرہ روزہ اخبار نکال رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ روزنامہ ''انقلاب جدید'' پٹنہ سے بھی وابستہ ہیں۔ (ڈاک سے)

● شہادہ، 9 رجنوری۔ شہادہ میں آل مہاراشٹر اردو، مراٹھی تقاریر و بزل خوانی کا مقابلہ منعقد کیا گیا جس میں تقریباً ساٹھ طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔ یہ پروگرام حیدر بھائی نورانی کے والد قطب علی نور جی بھائی نورانی کی یاد میں گذشتہ بیس برسوں سے پابندی سے منعقد ہورہا ہے۔ یہ پروگرام ''ادارۂ بزم نو'' کے اراکین خصوصاً پروفیسر سید لیاقت علی، جمیل خاں، منظور خاں، رضی الدین منشی اور سرسید ہائی اسکول کے اسٹاف کی مساعی کا نتیجہ تھا۔

شہادہ شہر میں اردو لائبریری کے قیام اور تقریری مقابلے کی شروعات کی وجہ سے اردو سے دلچسپی رکھنے والوں میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے اور غیر اردو داں طبقہ بھی اب اردو کی جانب مائل ہورہا ہے۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی، 29 رجنوری۔ یومِ جمہوریہ کے موقعے پر منعقد کیے جانے والے اردو اکادمی کے تاریخی وروایتی مشاعرے کا انعقاد 28 رجنوری کی شب لال قلعہ کے سبزہ زار پر کیا گیا۔ اس موقعے پر دہلی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر شعیب اقبال، وزیرِ تعلیم اروندر سنگھ لولی، وزیرِ ٹرانسپورٹ ہاروٹ اتائی ہارون یوسف، وائس چیئرمین اردو اکادمی دہلی م۔ افضل اور سکریٹری فن وثقافت حکومتِ دہلی محترمہ گیتابالی، ایڈیشنل سکریٹری ڈی کی پاڈے، ہندی، پنجابی، سنسکرت اور سندھی اکادمیوں کے سکریٹریز اور دیگر سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔ اس موقعے پر شعیب

اقبال نے کہا کہ اردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ یہ ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ اس لیے اس زبان کی ترقی و بقا کے لیے ہمیں مل جل کر کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ذوق، غالب، مومن سب نے لال قلعہ کے مشاعروں کے ذریعے ہی اس زبان کا لوہا منوایا ہے اس لیے ہمیں اس جگہ کی روایت کو برقرار رکھنا ہے۔

اروندر سنگھ لولی نے جدوجہد آزادی میں اردو شعرا کے سرگرم رول کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج ہمیں مجاہدین آزادی کی کوششوں کے صلے میں ہی یہ دن نصیب ہوا ہے کہ ہم یہاں مشاعرہ جشن جمہوریت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ مسٹر م. افضل نے مشاعرے کی لال قلعے میں واپسی کو مرکزی اور ریاستی حکومتوں، آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا، وزیر اعلا دہلی، شعیب اقبال، تاجدار بابر اور چودھری متین احمد، کپل سبل وغیرہ کی کوششوں کا ثمرہ قرار دیا۔

مشاعرہ جشن جمہوریت کا آغاز 1950 میں ہندستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے لال قلعے میں کیا تھا۔ 2001 میں لال قلعے میں گولی سانحے کے بعد یہاں اس کے انعقاد پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ مشاعرے کا آغاز قومی ترانہ اور ترانۂ ہندی سے کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت م. افضل اور نظامت منصور عثمانی نے کی جبکہ پروگرام کی ابتدائی نظامت کے فرائض رئیس اعظمی نے انجام دیے۔ سکریٹری اردو اکادمی، دہلی مرغوب حیدر عابدی کے اظہار تشکر کے ساتھ مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔ اس میں منشاء الرحمٰن خاں منشا، پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، وقار مانوی، ثریا مہر، منور رانا، منصور عثمانی، سردار نرمل سنگھ نرمل، قاسم امام، ڈاکٹر عظیم امروہوی، طالب رامپوری، ملکہ نسیم، ابراہیم اشک، ساغر خیامی، انا دہلوی، مخدوم زادہ مختار عثمانی، شہباز ندیم ضیائی، حمید گوہر، ماجد دیوبندی، خوشبیر سنگھ شاد، شبنم عشائی، الطاف ضیا، جاوید عرشی، پاپولر میرٹھی، عازم کوہلی، ممتاز نسیم، اعجاز انصاری، اقبال اشہر، متین امروہوی، شعیب مرزا اور رؤف رامش نے اپنے کلام سے نوازا۔ (راشٹریہ سہارا نئی دہلی)

● نئی دہلی، 29 رجنوری۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں مشاعرہ جشن جمہوریت جہلم لان میں منعقد ہوا۔ تمام شرکا و سامعین نے یونیورسٹی کے سابق طالب علم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر شکیل جہانگیری کی موت پر گہرے دکھ کا اظہار کیا، جن کا گزشتہ دنوں ایک کار حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ بعد ازاں مشاعرے کا آغاز ہوا جس میں مخمور سعیدی، کمال احمد صدیقی، مظفر حنفی، اسد رضا، ثمر نو پوری، منور رانا، احمد علوی، بانو دہلوی، معین شاداب، راشد ندیم، اعجاز انصاری، عمیر منظر، ممتاز نسیم، سنیتا رینا، شعیب مرزا، جاوید عرشی، راشد حامدی، ساغر خیامی، ظہیر ہاشمی صاحبان نے کلام پیش کیا۔

اس مشاعرے کا افتتاح وائس چانسلر پروفیسر جی کے چڈھا نے کیا جبکہ صدارت پروفیسر کمال احمد صدیقی نے کی اور نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ (اخبار مشرق دہلی)

جانے والوں کی یاد

معین احسن جذبی

● نئی دہلی، 13 رفروری۔ معروف ترقی پسند شاعر اور شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے سابق استاد ڈاکٹر معین احسن جذبی کا 93 سال کی عمر میں علی گڑھ کے سرسید نگر میں واقع ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر جذبی کی پیدائش 21 راگست 1912 کو مبارکپور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی تھی۔ ان کی نصف درجن سے زائد کتابیں منظر پر آئیں۔ جن میں ''سخن مختصر''، ''فروزاں'' اور ''گداز شب''، ''جذبی کے شعری مجموعے ہیں اور'' حالی کا تنقیدی شعور'' ان کی تنقیدی اور تحقیقی کتاب ہے۔ وہ'' کہتا ہوں سچ کہ......'' زیر عنوان اپنی خودنوشت بھی لکھ رہے تھے جو نامکمل رہ گئی۔ ان پر کئی یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے۔ جذبی کو غالب ایوارڈ، افتخار میر ایوارڈ، مہاراشٹر اردو اکادمی ایوارڈ، ہریانہ اردو اکادمی ایوارڈ، اقبال سمان، کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، دہلی اردو اکادمی ایوارڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب ایوارڈ وغیرہ جیسے متعدد اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ ڈاکٹر جذبی کے انتقال پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعزیتی جلسے منعقد کیے گئے اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

نظر برنی

● نئی دہلی، 23 رجنوری۔ طنز و مزاح کے مشہور شاعر، صحافی اور مصنف ڈاکٹر نظر برنی کا اتوار کی صبح 6 بجے (سعودی وقت کے مطابق) 63 سال کی عمر میں مکہ مکرمہ میں انتقال ہو گیا۔ موصوف فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے 13 رجنوری کو اپنی اہلیہ کے ساتھ سعودی عرب گئے تھے جہاں نمونیا کی شکایت پر انھیں ہفتہ کے روز اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر نظر برنی 17 رنومبر 1941 کو بلند شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ مشہور شاعر خضر برنی کے بیٹے تھے۔ انھوں نے اعلا تعلیم علی گڑھ و دہلی میں حاصل کی اور مگدھ یونیورسٹی سے مولانا محمد علی جوہر پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ جوہر پر ان کی تصنیف کردہ دو کتابیں بھی منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ مزاحیہ شاعری میں ''گستاخی معاف''، ''چچے''، ''کفگیر''، ''گورکھ دھندا'' کے عنوان سے ان کے مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ''گستاخی معاف'' پر انھیں اردو اکادمی، دہلی کا انعام برائے 1999 بھی ملا۔ 1965 میں انھیں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں مرزا غالب ایوارڈ پیش کیا گیا۔ 1993 میں انٹرنیشنل لائنس کلب نے انھیں ایوارڈ سے نوازا۔ ''بوئے گل''، ''متاعِ نظر''، ''ذوقِ نظر'' ان کے دیگر شعری مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو کے لیے لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ''شمع فروزاں'' بھی دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

خضر برنی کے فن اور شخصیت پر بھی ان کی کتاب منظر عام پر آچکی ہے۔ اس کے علاوہ ''لہریں'' کے عنوان سے وہ ایک 15 روزہ اخبار بھی نکال رہے تھے۔ نظر برنی جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ڈپٹی لائبریرین کے طور پر ریٹائر ہوئے تھے۔ لیکن ان کی ادبی وصحافتی سرگرمیاں تادمِ مرگ جاری رہیں۔

داراب بانو وفا

● لکھنؤ۔ لکھنؤ سے محترمہ نزہت فاطمہ نے اطلاع دی ہے کہ 13 رجنوری کو جمعرات کی رات محترمہ عزیز بانو داراب وفا کا انتقال ہوگیا اور اگلے دن بعد نماز جمعہ ان کی تدفین عمل میں آئی۔ محترمہ داراب بانو وفا اردو کی ایک نغز گو شاعرہ تھیں، ان کی غزلوں میں ایک ایسی مہذب خاتون کا دل دھڑکتا تھا جو اپنے نسوانی جذبات واحساسات کا اظہار بڑے مہذب لیکن اثر انگیز لہجے میں کرنے پر قدرت رکھتی تھی۔ وہ مشاعروں میں اپنا کلام اسی مہذب اور اثر آفریں لہجے میں سناتی بھی تھیں اور سننے والوں کو مسحور کردیتی تھیں۔ مشاعروں میں ان کی مقبولیت ترنم کی بجائے ان کی خوبیِ کلام کی مرہونِ منت تھی۔ افسوس یہ ہے کہ انھوں نے نہ تو رسائل میں اپنے کلام کی اشاعت کی طرف توجہ دی، نہ ان کا کلام کتابی شکل میں سامنے آیا۔ یہ ہم عصر اردو شاعری کا ایک بڑا زیاں ہے۔ ان کی دفات کے بعد ہی سہی ان کا مجموعۂ کلام شائع ہونا چاہیے۔ یہ کام اتر پردیش اردو اکادمی بہ سہولت کرسکتی ہے۔

اثر انصاری

● مئوناتھ بھنجن، 10 رجنوری۔ اردو کے معروف شاعر، نثر نگار اور مجاہدِ آزادی اثر انصاری کا طویل علالت کے بعد 7 رجنوری 2005 بروز جمعہ 10 بجے انتقال ہوگیا۔ اثر انصاری 1923 میں مئو کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ زمانۂ طالب علمی میں ہی تحریک آزادی میں شامل ہوگئے اور 1942 کی ''بھارت چھوڑو تحریک'' کے دوران انھوں نے مئو شہر کی قیادت بھی کی۔ 1952 میں وہ مئو شہر کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اثر انصاری کا پہلا مجموعۂ کلام ''کم وکیف'' 1947، دوسرا مجموعۂ کلام ''افکار پریشاں'' 1980، تیسرا شعری مجموعہ ''زبانِ غزل'' 1987، چوتھا مجموعۂ کلام ''آئینہ در آئینہ'' 1990 اور پانچواں مجموعۂ کلام ''پیراہن گل'' 1994 میں شائع ہوا۔

اثر انصاری کی نثری تصانیف میں ''تذکرہ سخنورانِ مئو'' سفر حج کے شب و روز''، اُردو شاعری میں ہند تہذیب کی عکاسی'' اور ''دبستانِ شبلی کے نامور انشاپرداز'' قابلِ ذکر ہیں۔ انھیں اردو ادب کی خدمت کے لیے ''امتیازِ میر'' اور توصیفی اسناد سے نوازا گیا۔ ''اثر انصاری: حیات وخدمات'' کے موضوع پر ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے ویر بہادر پوروانچل یونیورسٹی، جون پور سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

پروفیسر امیر عارفی

● نئی دہلی، 13 رفروری۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر امیر عارفی کا شام 5.30 بجے حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ تقریباً ڈھائی مہینے قبل حیدرآباد میں سڑک حادثے میں وہ زخمی ہوگئے تھے۔ وہ سر میں شدید چوٹ کے باعث اب تک I.C.U. میں زیرِ علاج تھے۔ ان کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ، ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ وہ 63 برس کے تھے۔ ان کی تصانیف میں نیاز فتح پوری (تحقیق وتنقید)، قاضی عبدالغفار فن اور شخصیت اور دکنی اردو لغت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر امیر عارفی کے انتقال پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، دہلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعزیتی جلسے منعقد کیے گئے اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

شکیل جہانگیری

● نئی دہلی، 25 رجنوری۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نوجوان استاد، ممتاز شاعر اور ادیب ڈاکٹر شکیل جہانگیری کا سڑک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 40 سال تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو چھوٹے بچے ہیں۔ مرحوم 24 جنوری کو اپنے آبائی وطن شجاعت پور، بریلی سے جامعہ (دہلی) کے لیے روانہ ہوئے تھے لیکن راستے میں گڑھ مکتیشور کے مقام پر سڑک حادثہ ہوگیا۔ حادثے کے وقت مرحوم کار کو خود ڈرائیو کررہے تھے جبکہ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ اور دونوں بچے بھی تھے۔ ڈاکٹر شکیل جہانگیری نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ''اردو کی لوک روایات: چہار بیت کے حوالے سے'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی تھی۔ اس موضوع پر ان کی کتاب بھی شائع ہوچکی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں 27 رجنوری کو تعزیتی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں شعبے کے تمام اساتذہ نے مرحوم سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نظر برنی اور ڈاکٹر شکیل جہانگیری کے اچانک انتقال پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، شعبۂ اردو، میرٹھ یونیورسٹی میں تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ دہلی کی ادبی، سماجی اور ثقافتی تنظیم ''میزان'' کے زیرِ اہتمام اوکھلا میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں جامعہ اور اطراف کے بہت سے حضرات نے شرکت کی۔

جناب یوسف ٹینگ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہر تحریک کے پیچھے ایک کارساز ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے کارساز تھے۔ انسان دوستی، انکسار، متناطیسیت ان کی شخصیت کا جز تھیں۔ انھوں نے ہماری کلاسیکی جمالیاتی قدروں کو بحال کیا۔ پروفیسر ظہورالدین، پروفیسر شارب ردولوی اور جناب زبیر رضوی نے بھی صدارتی کلمات پیش کیے۔

تبصرہ و تعارف

تنقیدی افکار/شمس الرحمان فاروقی

صفحات: 347، قیمت: -/148 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1 آر.کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: جاوید رحمانی

"تنقیدی افکار" کے مصنف اردو کے عہد ساز نقاد شمس الرحمان فاروقی ہیں۔ تنقیدی افکار' پہلی بار 1983 میں اردو رائٹرس گلڈ، الہٰ آباد سے شائع ہوئی تھی جس میں سات مضامین تھے جو 1977 سے 1982 تک لکھے گئے تھے۔ اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس کا دوسرا ایڈیشن 3 مضامین کے اضافے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ "تنقیدی افکار" پر 1986 کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی فاروقی صاحب کو مل چکا ہے۔ اس کتاب کے تمام مضامین نظریۂ نقد اور مشرق و مغرب کی شعریات سے متعلق ہیں۔ فاروقی دیباچے میں نظری بمعنی نظریاتی استعمال کرتے ہیں، عام استعمال میں نظری بمعنی منسوخ مستعمل ہے، فاروقی اپنے استعمال کا اثبات لغات کشوری سے کرسکتے ہیں لیکن عام استعمال میں یہ اس طرح نہیں۔ اس کتاب کا پہلا مضمون ہے "کیا نظریاتی تنقید ممکن ہے؟" اس کی ابتدا میں ہی فاروقی یہ واضح کر دیتے ہیں کہ "تنقید عموی اور سرسری اظہار رائے نہیں ہے، غیر قطعی اور گول مول بات کہنا نقاد کے منصب کے منافی ہے۔ تنقید کا مقصد معلومات میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ علم میں اضافہ کرنا ہے۔" اس واضح اعلان کے بعد تعجب ہوتا ہے جب ہم فاروقی کے پسندیدہ نقادوں میں سرِ فہرست آل احمد سرور اور حسن عسکری کے نام دیکھتے ہیں۔ کتاب کا انتساب بھی حسن عسکری کے نام ہے۔ فاروقی اس مضمون میں بتاتے ہیں کہ "جدید تنقید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پچھلی تنقید کی مزعوماتی اور ادعائی فضا کی جگہ آزاد خیالی کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی کمزوری یہ ہے کہ اس نے اکثر صحیح ترین بیان کو تلاش کرنے کے بجائے کام چلاؤ بیان پر اکتفا کیا ہے یعنی فن پارے کو بیان کرنے کے لیے بہترین طریقہ نہیں اختیار کیا ہے۔"

فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ "فن میں جو چیز لازمی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہم کسی نہ کسی طرح کے تجربے سے دوچار ہوتے ہیں۔ چونکہ بہت سی تحریروں کے ذریعے ہمیں کسی قسم کا تجربہ حاصل نہیں ہوتا اس لیے فن پارہ اور غیر فن پارہ میں فرق کرنا مشکل نہیں۔ لہٰذا نظریاتی تنقید کا سب سے پہلا کام یہ ٹھہرا کہ وہ فن پارے کی پہچان فن پارے کے حوالے سے متعین کرسکتی ہے اور چونکہ فن پارے میں لازمیت ہوتی ہے اس لیے اس نظریاتی تنقید میں بھی لازمیت اس حد تک ہوگی جس حد تک فن پاروں میں ہوتی ہے۔"

یہ لازمیت جدید تنقید میں فاروقی کے ہاں سب سے زیادہ ملتی ہے اور اسی لیے وہ سب سے کامیاب جدیدیت نقاد بھی ہیں۔ دوسرا مضمون "جدید شعری جمالیات" ہے جس میں جدیدیت کی شعری جمالیات ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاروقی لکھتے ہیں کہ "بعض حلقوں میں جو یہ خیال (غالباً ترقی پسند حلقوں کے زیر اثر یا ان کے علی الرغم) پیدا ہوگیا ہے کہ جدید شاعری کسی جدید قسم کی جمالیات کی متقاضی ہے، یہ محض ایک غلط فہمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ غالب اور میر ہمارے عہد میں ہوتے تو ہماری طرح کی شاعری کرتے اور اگر ہم لوگ ان کے زمانے میں ہوتے تو ان کی طرح کی شاعری کرتے۔ یہ نتیجہ اس حقیقت کی روشنی میں ناگزیر ہے کہ غالب اور میر سے ہم آج بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کی بصیرتیں آج بھی ہمارے لیے صحیح اور کارآمد ہیں۔"

یہ نتیجہ ناگزیر تو ہے لیکن اس کا اظہار فاروقی سے حیرت انگیز ہے خصوصاً اس تناظر میں کہ فاروقی جدیدیت کے رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن فاروقی کی یہ جرأت ہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے انھیں جدیدیت سے باہر بھی بامعنی اور کارآمد رکھا ہے۔ اگلا مضمون "ارسطو کا نظریۂ ادب" ہے۔ یہ اردو میں ارسطو پر بہترین مضمون ہے۔ چوتھا مضمون "ہماری شاعری پر ایک نظر ثانی" ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب کے اس بیان پر فاروقی کی خاموشی حیرت انگیز ہے "حالی کا مقدمہ اور مسدس، دونوں سے صاف ظاہر ہے کہ شعر و شاعری کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر اخلاقی ہے۔ پیش نظر کتاب کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اس کے مصنف کا نقطۂ نظر ادبی ہے لیکن حالی کی راہوں سے اختلاف کرنا مقصود نہیں بلکہ جو کچھ انھوں نے چھوڑ دیا تھا اسے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

یہ مصنف کا حسن ظن ہے، اس میں شک نہیں کہ "ہماری شاعری" اپنے زمانے کی بااثر کتاب تھی لیکن مقدمہ کی ہمسری کا دعوا تو کجا، اس کے ساتھ ہماری شاعری کا نام لینا بھی ادبی کفر ہے۔ فاروقی لکھتے ہیں کہ "اپنی موجودہ حالت میں ہماری شاعری نظریہ سازی اور کلیہ تراشی کی ایک غیر معمولی کوشش ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے، اس میں بیان کردہ بہت سے نکات و مطالب نے جدید تنقید کی تعمیر میں خاموش مگر گہرا کام کیا ہے۔"

فاروقی ادیب کو نقاد بھی کہتے ہیں اور "ہماری شاعری" کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "حالی کے مقدمے کا تتمہ ہوتے ہوئے بھی اس کی توسیع تنسیخ اور

استحکام کرتی ہے۔" یہ ہمارے عہد کے ایک بااثر اور بڑے نقاد کی مروت بول رہی ہے۔ اگلا مضمون "نثری نظم یا نثر میں شاعری" معرکے کا ہے۔ اس میں فاروقی کی صاف گوئی قدم قدم پر نمایاں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "نثری نظم ہمارے ادب میں ایک صنف کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکی ہے۔" اور کیوں؟ اسی کا جواب یہ مضمون ہے۔ اسی طرح "نظم کیا ہے؟" بھی معرکتہ الآرا مضمون ہے۔ وہ مشرق و مغرب کی شاعری اور تنقید کے حوالے سے کافی بحث کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "ہر وہ منظومہ جو غزل نہیں ہے، نظم ہے اور نظم کی بنیادی صفت وحدت ہے جس کا ایک فاعل ربط و تسلسل ہے۔" یہ ربط و تسلسل کئی طرح کا ہوتا ہے اور ہر نظم کے ساتھ اور ہر قسم کی نظم کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔"

ساتواں مضمون "اردو لغات اور لغت نگاری" ہے جو پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب "لغت نویسی کے مسائل" میں بھی شامل ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مقدمے میں لکھا ہے کہ "پروفیسر سید حسن اور شمس الرحمان فاروقی کے مقالے اس سمینار میں نہیں پڑھے گئے لیکن چونکہ ان کا موضوع لغت نویسی ہے اور یہ وقیع مقالے ہیں ان کو بھی شامل کیا جا رہا ہے۔" اس میں فاروقی صاحب نے لغت نگاری کی نظریاتی اساس تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس موضوع کا یہ نہایت عالمانہ تجزیہ ہے۔ "ادبی تخلیق اور ادبی تنقید" ان مضامین میں سے ایک ہے جو تنقیدی افکار کے اس ایڈیشن میں شامل کیے گئے ہیں اور فاروقی صاحب نے گذشتہ چند برسوں میں جو چند نہایت عمدہ مضامین لکھے ہیں یہ ان میں سے بھی ایک ہے۔ اس میں تخلیق یا تنقید، بالادستی کس کی؟ یہ مسئلہ اٹھایا گیا ہے جس پر کم و بیش ہر جدید نقاد نے لکھا ہے جن میں خصوصیت کے ساتھ وارث علوی کا مضمون "کیا نقاد ادب کا غیر اہم آدمی ہے" اور فاروقی کا یہ مضمون خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ وارث علوی نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا تجزیہ کیا ہے، فاروقی کا بھی اپنا انداز ہے لیکن علمی بنیادیں اس مضمون کی زیادہ مضبوط ہیں۔ فاروقی لکھتے ہیں کہ "تنقید ہمارے ادبی معاشرے میں مرکزی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔" مزید کہتے ہیں کہ "تنقید نے ہمارے ادب کی سربراہی کا بوجھ کچھ تو اپنے ہی مزعومات کے زیر اثر اور کچھ پیراں نمی پرند مریداں می پرانند کے مصداق ہمارے ادبی اور تخلیقی معاشرے کے مفروضات اور ضرورتوں کے باعث قبول کر لیا۔ بیسویں صدی کا وسط آتے آتے نقادوں کے قدم میدان ادب میں پوری طرح جم چکے تھے اور اسی اعتبار سے ان میں رعونت بھی آگئی تھی۔ میں نے اب تک اس تنقید اور اس نقاد کا ذکر نہیں کیا ہے جو محمد حسن عسکری کے بعد کے ہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ نقاد کی برتری تو ہمارے یہاں 1930-1940 کی دہائی میں ہی پوری طرح قائم ہو چکی تھی۔ دوسری اور زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ محمد حسن عسکری کے بعد آنے والے لوگوں میں میرا بھی نام ہے اور یہ مناسب ہے کہ میرا اور میرے ساتھ والوں کا محاکمہ ہمارے بعد والوں کے ہاتھوں انجام پائے۔"

اگلے مضامین تعبیر کی شرح، اواخر صدی میں تنقید پر غور و خوض اور شاعری کا ابتدائی سبق ہیں۔ ان میں "اواخر صدی میں تنقید پر غور و خوض" خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ "ادب کے بارے میں غور و فکر کی بات کریں تو اپنی روایت کو سمجھنا، اس کی بازیافت اور اس کا دوبارہ بیان اب میرے لیے سب سے اہم وظیفۂ فکر و عمل ہیں۔ آج ہمارے لیے سب سے بڑے کام یہ ہیں: اول تو اپنی تہذیبی میراث کی قدر و قیمت کو پھر سے قائم کرنا، اور اس کے لیے سب سے پہلے قدم یہ اٹھانا کہ کلاسیکی شعریات کو اسٹیج کے مرکز میں لے آنا۔ یہ شعریات محض غزل کے لیے نہیں بلکہ تمام کلاسیکی اصناف شعر و نثر کے لیے ہمارے کام آئے گی"۔ "تنقیدی افکار" کے تمام مضامین کسی نہ کسی سطح پر یہ کام کرتے ہیں اور اسی لیے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے لکھا ہے کہ "کونسل اس کتاب کو بڑے فخر کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔"

●

دیوان درد / ڈاکٹر نسیم احمد

صفحات: 336، قیمت: -/160 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1 آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: سراج نقوی

خواجہ میر درد اردو کے چند اہم ترین شعرا میں سے ایک ہیں۔ محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں انھیں "زبان اردو کے چار رکنوں میں سے ایک رکن" قرار دیا ہے۔ جبکہ میر نے "نکات الشعرا" میں درد کو "شاعر زور آور ریختہ" مانا ہے۔ لیکن اردو کے اتنے اہم اور بڑے شاعر کی شاعری کو بھرپور تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوئی تفصیلی کوشش اب تک نہیں ہوئی، جو اردو والوں کی اپنے ادبی ورثے سے افسوس ناک لاتعلقی کا ثبوت ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے دیباچے میں مشہور محقق رشید حسن خاں نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "درد کی شاعری سے متعلق ایک بھرپور تنقیدی کتاب کی بڑی ضرورت ہے۔" یہی صورت حال درد کے دیوان کی ترتیب و تدوین کے بارے میں بھی پائی جاتی ہے۔ کتاب کے دیباچے کا آغاز ہی رشید حسن خاں نے اس شکایت کے ساتھ کیا ہے کہ "خواجہ میر درد جیسے اہم شاعر کے چھوٹے سے اردو دیوان کا (جو شاعرانہ قدر و قیمت کے لحاظ سے بڑا ہے) کوئی تحقیقی ایڈیشن اب تک سامنے نہیں آیا تھا۔" ڈاکٹر نسیم احمد کے مرتب کردہ زیر تبصرہ دیوان کے بارے میں دیباچہ نگار نے اس بات کی ستائش کی ہے کہ محنت اور دیدہ ریزی سے اس کی تدوین کی گئی ہے۔

دیوان درد کے اس ایڈیشن میں رشید حسن خاں کے دیباچے کے علاوہ خود

مرتب کا تحریر کردہ تقریباً 95 صفحات پر مشتمل مقدمہ بھی شامل ہے جس میں دیوانِ درد کے مختلف ایڈیشنوں، قلمی نسخوں، ان کی صحت اور عدم صحت، اشاعت اور دیگر تفصیلات کو شامل کیا گیا ہے۔ مقدمے کی تفصیلات مرتب کی تحقیقی صلاحیتوں اور ژرف نگاہی کا ثبوت ہیں۔ مقدمے کے آغاز میں تصنیفاتِ درد کا مختصر تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تحقیقی انداز میں ان کے زمانۂ تصنیف و تالیف پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی ضمن میں درد سے منسوب "سوز دل"، "واقعات درد" اور "حرمت غنا کی حقیقت" کے عنوان سے اپنی مختصر تحریر میں فاضل مرتب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مذکورہ تینوں تصانیف درد کی نہیں ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر نسیم احمد نے اس سلسلے میں جو استدلال کیا ہے اس میں حوالوں کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ محمد حسین آزاد، محسن علی محسن، صاحب گل رعنا، رام بابو سکسینہ، الف۔ د۔ نسیم، خلیل الرحمان داؤدی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور ڈاکٹر پریتم سنگھی نے مذکورہ تینوں کتابوں کو تصانیف درد میں شامل کیا ہے، لیکن مرتب نے اس معاملے میں حبیب الرحمان خاں شیروانی، ڈاکٹر وحید اختر اور ڈاکٹر قاضی جمال کو سند مانا ہے کہ جنھوں نے مذکورہ کتابوں کو درد کی تصانیف ماننے سے انکار کیا ہے۔ اپنے اخذ کردہ نتیجے کے حق میں مرتب اس حد تک چلے گئے ہیں کہ انھوں نے مذکورہ تصانیف کو "محمد حسین آزاد کی ذہنی اختراع" قرار دے دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ نثر میں شاعرانہ تخیل، خیالی رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی کے انداز کے سبب محمد حسین آزاد کی محققانہ حیثیت متاثر ہوئی ہے، لیکن بغیر کسی ٹھوس دلیل کے درد کی تصانیف کے تعلق سے آزاد کے دعوے کو ذہنی اختراع قرار دینا بھی درست نہیں، اور وہ بھی صرف اس بنا پر کہ "آب حیات سے قبل کسی تذکرے یا معاصر کتاب میں درد کے نام سے ان کا ذکر نہیں ملتا۔" دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مضمون میں لاہور کے ایک محقق الف۔ د۔ نسیم کا ذکر کرتے ہوئے مرتب نے لکھا ہے کہ انھوں نے "تینوں کو درد کی تصانیف میں شامل کرلیا ہے اور ان کا تعارف اس طور پر کرایا ہے جیسے واقعتاً یہ کتابیں ان کی دسترس میں ہیں یا کم از کم ان کی نظر سے گزر چکی ہیں۔" مرتب نے الف۔ د۔ نسیم کے یہ جملے نقل کیے ہیں "واقعات درد اور سوز دل نور الحسن خاں صاحب بھوپالی کی کوشش سے شائع ہو چکے ہیں اور حرمت غنا مطبع دہلی انصاری سے شائع ہو چکا ہے۔" مذکورہ جملے سے ایسا لگتا ہے گویا مرتب کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ الف۔ د۔ نسیم نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے۔ جبکہ "فارسی دیوان" عنوان کے تحت درد کے فارسی دیوان کے دو ایڈیشنوں کا ذکر کرتے ہوئے خود مرتب نے دوسرے ایڈیشن کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے کہ "دیوان فارسی کا دوسرا علاحدہ ایڈیشن جو راقم کے علم میں ہے کلیاتِ مذکور کے تقریباً بیالیس برسوں بعد نواب سید نور الحسن خاں کے حسب فرمائش مطبع انصاری دہلی سے چھپ کر 1309ھ 1892 میں شائع ہوا۔" ظاہر ہے ابہام کی کیفیت خود مرتب کے مقدمے میں بھی کئی جگہ موجود ہے۔

درد کی تصانیف کے علاوہ مقدمے میں "کلام درد کے چند قابل ذکر مطبوعہ نسخے" عنوان کے تحت 6 مختلف نسخوں پر نگاہ ڈالی گئی ہے اور ان تمام نسخوں کو حد درجہ ناقص، دانستہ اور نادانستہ تحریفات سے پر، معمولی ایڈیشن، سہل نگاری و آسان پسندی سے ترتیب دیا گیا ایڈیشن یا کم حیثیت و ناقابل اعتبار ایڈیشن بتا کر انھیں تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ شاید مرتب کے نزدیک اپنے ایڈیشن کی افادیت ثابت کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ بہرحال ان تمام نسخوں پر کی گئی بحث درد پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک کارآمد چیز ہے۔ مآخذ و علامات نسخ، تعارف نسخ، طریقۂ کار، ضمیمۂ اوّل و دوئم، حواشی متن اور حواشی مقدمہ سے متعلق تحریروں نے مقدمے کی اہمیت میں اضافہ کردیا ہے اور کلام درد کے مطالعے کے دوران انھیں پیش نظر رکھ کر قاری کو اپنی رائے قائم کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ دیوان درد کے بازار میں فی الحال دستیاب نسخوں میں قومی اردو کونسل کے شائع کردہ اس نسخے کو اس اعتبار سے بھی اہمیت دی جاسکتی ہے کہ کاتب اردو کمپیوٹر یا پروف ریڈر کی سطح پر اسے بڑی حد تک غلطیوں سے پاک رکھا گیا ہے۔ ٹائٹل کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح دیدہ زیب ہے اور کاغذ بھی معیاری ہے۔ کم قیمت اور مذکورہ خوبیوں کے سبب امید ہے کہ درد کی شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں میں ڈاکٹر نسیم احمد کا مرتب کیا ہوا یہ نسخہ پذیرائی حاصل کرے گا اور پسند کیا جائے گا۔ خصوصاً اردو ادب کے طلبہ کے لیے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

•

اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم / پروفیسر حنیف کیفی

صفحات: 608، قیمت: -/182 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-66

مبصر: عبدالرب

اردو کی شعری اصناف میں جن اصناف کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے ان کے بارے میں تو بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ان اصناف کی تعیین قدر کی کوشش بہت کم کی گئی ہے نیز ان اصناف کی تشکیل کن اجزا سے ہوئی ہے اس پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ 1857 کے بعد کا اردو ادب ان معنوں میں ماقبل ادب سے مختلف ہے کہ اس میں نئی اصناف اور نئے موضوعات عام طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ نئی ہیئتوں کا استعمال 1857 کے بعد بہت زیادہ کیا گیا ہے اگرچہ ان تمام ہیئتوں کو اصناف کی حیثیت سے کہاں تک قبول کیا جاسکتا ہے یہ مسئلہ اب بھی بحث طلب ہے لیکن تمام ہیئتوں میں جو تجربے کیے گئے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ ان تجربات کے مطالعے کی کوشش بالکل نہیں کی گئی۔ اس طرف ڈاکٹر عنوان چشتی مرحوم نے غالباً پہلی مرتبہ توجہ کی اور "اردو شاعری میں ہیئت

کے تجربے'' کے عنوان سے پہلی مبسوط کتاب لکھی جسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے بعد اس سلسلے کا دوسرا اہم کام ڈاکٹر حنیف کیفی نے کیا ہے۔ ان کی کتاب ''اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم'' اردو نظم کی مختلف ہیئتوں کا نسبتاً زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتی ہے اور یہ اپنے وسیع تر مطالعے کو ایک مرکز فراہم کرنے کی بھی کوشش ہے۔ ان کی یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی۔ یہ کتاب طویل عرصے سے نایاب تھی، اب قومی اردو کونسل نے مصنف کی نظر ثانی کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ یہ نظم معرا اور آزاد نظم کی مختلف ہیئتوں کا ابتدا سے 1947 تک کا مطالعہ ہے۔ تعارف اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''حنیف کیفی کا یہ علمی و ادبی کام اس موضوع پر اب تک سب سے اچھا کام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے ذریعے ہمارے پڑھنے والوں کو نظم معرا اور نظم آزاد کی خصوصیات اور ان کے امکانات سمجھنے کا موقع ملے گا۔''

یہ کتاب سات ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب'' جدید اردو نظم میں تجربے اور ان کا پس منظر (آغاز سے 1947 تک)'' ہے جس میں مصنف نے شعر و ادب میں تبدیلیوں کی نوعیت، کامیاب ادبی تجربے کی ضرورت وخصوصیت اور اردو شاعری میں تجربوں کا پس منظر، اردو شاعری میں ہیئت کے تجربوں کا باقاعدہ آغاز وغیرہ کا جائزہ لیا ہے اور اردو میں انگریزی نظموں کے ترجموں کا بھی مطالعہ پیش کیا ہے، نیز عبدالحلیم شرر، سرعبدالقادر، نظم طباطبائی، مولانا تاجور نجیب آبادی اور عظمت اللہ خاں وغیرہ کے تجربات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اسی باب میں وہ اردو کی پابند نظموں میں بحر کے استعمال کی جدت کاریوں کا بھی جائزہ لیتے ہیں اور گیتوں کے عام رواج، ترائیلے کی ابتدا وغیرہ سے ہوتے ہوئے اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم کے باقاعدہ رواج تک آجاتے ہیں۔ دوسرا باب ''انگریزی بلینک ورس: فن اور ارتقا'' ہے۔ اس میں انگریزی کی آزاد نظموں کی تکنیک اور خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ جو پچاس صفحات کو محیط ہے۔ تیسرے باب میں ''فری ورس: ہیئت اور تکنیک'' کی سرخی قائم کی گئی ہے اور فری ورس کی تعریف، ہیئت اور تکنیک واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

چوتھا باب ''اردو میں نظم معرا کی ابتدا'' ہے جس میں اردو نظم معرا کا سلسلۂ نسب دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر انگریزی اور اردو نظم میں فرق ڈھونڈا گیا ہے۔ پروفیسر حنیف کیفی اردو میں نظم معرا کا موجد محمد حسین آزاد کو ٹھہراتے ہیں اور اس سلسلے میں جو اختلافات ہیں ان کا عمدہ تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ عبدالحلیم شرر، اسماعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی کی کاوشوں کا بھی جائزہ لیتے ہیں اور ''نظم معرا کی تحریک ومباحث کا محاکمہ'' کی سرخی قائم کرکے قطعی فیصلہ دیتے ہیں۔ ابتدائی دور کی دیگر معرا نظمیں بھی ان کی توجہ سے محروم نہیں۔ وہ ابتدائی دور کی تقریباً تمام معرا نظموں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ پانچواں باب ''نظم معرا کا عبوری دور'' ہے، جس میں شرر کے بعد سے 1935 تک، یعنی کم وبیش 35 کے مدوجزر کو پیش کیا ہے اس سلسلے میں۔ شرر کے رسالے ''دلگداز'' کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے وہ تاجور نجیب آبادی اور نظم معرا کی نئی تحریک اور عبوری دور کی تقریباً تمام دستیاب معرا نظموں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔

چھٹا باب'' آزاد نظم ابتدا سے 1947 تک'' ہے جس میں وہ آزاد نظم کا موجد تصدق حسین خالد کو قرار دیتے ہیں اور ان کی آزاد نظموں اور ن.م. راشد، میراجی اور دیگر شعرا کی نظموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ باب تنقیدی اعتبار سے زیادہ باوزن ہے۔

''نظم معرا 1935 سے 1947 تک'' ساتواں باب ہے جس میں 1935 کے بعد نظم معرا کی ترویج وترقی اور اس میں آزاد نظم کا حصہ، 1935 سے 1947 تک کی نظم معرا کا عمومی جائزہ، متعلقہ دور کی نظم معرا کے مختلف انداز پر مفصل گفتگو کی گئی ہے اور اہم شعرا کے تحت تصدق حسین خالد، میراجی، یوسف ظفر، مخمور جالندھری، ضیا جالندھری اور دیگر شعرا کی معرا نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں نظم معرا کی ترویج میں حلقۂ ارباب ذوق کی خدمات پر بھی مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق جیسا کہ معلوم ہے، ترقی پسندوں کے متوازی ایک اہم حلقہ تھا لیکن حلقۂ ارباب ذوق کی خدمات کا جائزہ اردو میں بہت کم لیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے مصنف کا حلقۂ ارباب ذوق کی خدمات پر الگ سے اور تفصیلی اظہار خیال قارئین کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے بعد حرف آخر کے تحت تمام مباحث کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور فرہنگ اصطلاحات اور اشاریے کی شمولیت اور اس کے اندراجات پر از سرِ نو غور وخوض نے اس کتاب کو اور زیادہ کارآمد بنا دیا ہے۔ اس کی اشاعت کے لیے قومی اردو کونسل مبارکباد کی مستحق ہے۔

•

بہارِ نو بہار/ رفعت سروش
صفحات: 144، قیمت: -/150 روپے
ناشر: نورنگ کتاب گھر، نوئیڈا
مبصر: ابوبکر عباد

سیاست کی طرح ادب میں بھی جماعت بندی رہی ہے اور ہے۔ اس جماعت بندی کی متعدد قسموں میں شخصی، علاقائی اور نظریاتی اہم ہیں۔ ان میں آخرالذکر سے فکر کو جلا ملتی ہے، شعر وادب میں تازگی پیدا ہوتی ہے اور بحث و مباحثے کے نئے گوشے وا ہوتے ہیں۔ جب کہ ابتدائی دونوں صورتوں کو جذباتی سوچ کی پیداوار سمجھنا چاہیے، جو فکر پر تعصب کا غلاف قائم کرتی اور غیر ضروری بحث و تکرار کو راہ دیتی ہیں۔ آج کے مصلحت پسند عہد میں ادبی جماعت بندی کی کھلی

اور دوسری قسم پر یقین نہ رکھنے والے کو مجاہد نہیں تو مردِ قلندر ضرور کہنا چاہیے۔ معتبر شاعر اور نثر نگار رفعت سروش کو اسی صف میں جگہ ملنی چاہیے۔

زیر نظر کتاب میں بہار کے سات شاعروں اور ادیبوں پر گیارہ مضامین میں سے شہاب الدین دسنوی، مظفر شہاب، سید احمد شمیم اور محمد سالم پر ایک ایک مضمون، انور عظیم اور پروفیسر شکیل الرحمان پر دو دو اور مظہر امام پر تین مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون تعزیتی تحریر ہے جو مصنف نے شہاب الدین دسنوی کی رحلت پر قلم بند کی تھی۔ محمد سالم پر مضمون دراصل ان کے مجموعۂ مضامین ''نئی سمت نئے تقاضے'' کا دیباچہ ہے جس میں رفعت صاحب نے کتاب کے مضامین پر گفتگو، ان کے حوالے سے صاحب کتاب کے تنقیدی شعور کا تعین اور روایتاً کتاب کی تعریف کی ہے۔ سید احمد شمیم کو رفعت صاحب نے بدن اور ماورائے بدن کا شاعر قرار دے کر ان کے مجموعے ''بے در و دیوار'' کے حوالے سے ان کی شاعری کا قرار واقعی جائزہ لیا ہے اور جبلی کو ان کے یہاں جنس کے استعارے کے طور پر دریافت کیا ہے۔ مظفر شہاب والا مضمون کئی حقائق پر سے پردہ اٹھاتا ہے، اس میں بعض ترقی پسندوں کی جھوٹی شہرت وعظمت اور بعض کی افسوسناک گمنامی کے اسباب بھی بتائے گئے ہیں۔ انور عظیم پر دو میں سے پہلے مضمون کو ان کا خاکہ کہا جاسکتا ہے جس میں ان کے زمانۂ عروج کے ڈھلنے اور بڑھاپے کی بے کسی کا اثر انگیز بیان ہے۔ دوسرا مضمون ان کے افسانے ''اجنبی کے ساتھ'' کا تجزیہ ہے جو بڑی خوبی اور خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمان سے متعلق مضامین میں ان کی دو کتابیں ''اختر الایمان' جمالیاتی لیجنڈ'' اور ''ہند اسلامی جمالیات'' کا انتہائی توجہ سے تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ پہلے مضمون میں رفعت صاحب نے اختر الایمان سے متعلق مصنف کے خیال کو سراہا ہے، بعض مواقع پر ان کی ہمنوائی کی ہے اور کہیں کہیں بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی انفرادی رائے بھی قائم کی ہے۔ اختر الایمان کو پسند کرنے اور پروفیسر شکیل الرحمان کی رایوں سے اتفاق کرنے کے باوجود وہ اختر الایمان کی شاعری کے ایک حصے کو سستی عشقیہ شاعری پر محمول کرکے اور ان کی نظم ''ترغیب اور اس کے بعد'' کو ''حسینہ کو پھسلانے اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے والی نظم'' بتاتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ایک جگہ شکیل الرحمان صاحب کی جانب بھی اشارہ کیا ہے، جہاں وہ اختر الایمان کی مشہور نظم ''ایک لڑکا'' کا بنیادی خیال There was a boy سے ماخوذ ہونے کو بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ضمناً انھوں نے علی سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' کو ناظم حکمت یار کی ترکی نظم کا چربہ اور کرشن چندر کے افسانے ''بت جاگتے ہیں'' کو روسی نظم کا رہین منت بھی کہا ہے۔ دوسرے مضمون میں رفعت صاحب کا لہجہ قدرے مناظرانہ ہے، متعدد جگہ شکیل صاحب سے اختلاف کیا ہے اور ان کی کتاب کی بعض کمیوں کو آشکار کیا ہے۔ اس مضمون میں رفعت صاحب ایک کثیر المطالعہ ناقد کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔

مظہر امام صاحب کی شخصیت، ان کی تنقید اور ان کے تحریر کردہ خاکوں سے متعلق رفعت سروش کی تینوں تحریریں ''مظہر امام: ہمہ جہت شخصیت''، ''مظہر امام کی تنقیدی بصیرت'' اور ''مظہر امام کے شخصی خاکے'' کسی کتاب کا دیباچہ یا تبصرہ نہ ہوکر مظہر امام کی بنیادی شناخت سے سروکار رکھتے ہیں۔ آزاد غزل کے موجد اور اس قافلے کے سالار کی حیثیت سے ایک عرصے تک اخبارات و رسائل کے صفحات اور جلسوں اور ادبی محفلوں میں ان کا ذکر کر رہا ہے۔ رفعت سروش کے مضامین کو ان مباحث کی توسیع کہنا شاید مناسب ہوگا کیوں کہ ان میں مظہر امام کی شخصیت، ان کے تنقیدی شعور اور ان کی دوسری صلاحیتوں پر تفصیلی مکالمہ قائم کیا گیا ہے؛ ضمناً جوش، فیض، فراق اور احتشام حسین وغیرہ کے ذکر کے ساتھ مختلف تحریکات و واقعات بھی زیر گفتگو آئے ہیں۔ رفعت سروش صاحب، مظہر امام کی تنقیدی آرا سے بیشتر اتفاق کرتے ہیں اور ان کی کچھ باتیں ناقدوں کو بطور وظیفہ یاد رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ ان کے ایک مضمون کو بہار کی درسی کتابوں میں شامل کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔ ان مضامین میں بعض مقامات ایسے آئے ہیں جہاں اختلاف کی گنجائش موجود تھی لیکن نہ جانے کیوں رفعت صاحب نے اس سے احتراز کیا ہے۔

کتاب توجہ سے پڑھی جانے کی مستحق ہے۔

●

حسنِ نظر / درشن کپور فلک

صفحات: 100، قیمت: درج نہیں

ناشر: درشن کپور فلک، 24۔ تیغ بہادر روڈ، دہرہ دون-248001

مبصر: احمد کفیل

''حسنِ نظر'' درشن کپور فلک کا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں 25 غزلیں، 23 نظمیں، ایک گیت اور 16 قطعات شامل ہیں۔ کہتے ہیں کہ شاعر وہی کامیاب ہوتا ہے جو اپنے تخیل اور پیرایۂ بیان کو کسی مخصوص نظریے کا پابند نہ بنائے۔ فن کاری کے اس نکتے سے فلک اچھی طرح واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''حسنِ نظر'' میں اچھی شاعری کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔ نظم ہو یا غزل شاعر کو دونوں پر قدرت ہے۔ غزل اور نظم کا مزاج جداگانہ ہونے کے باوجود شاعر کا مزاج ان دونوں ہی اصناف سے مطابقت رکھنے میں کامیاب ہے۔ یہ احساس خود شاعر کو بھی ہے اسی لیے پوری کتاب کے ایک صفحے پر غزل تو دوسرے پر نظم کا التزام رکھا ہے۔ لفظوں کی نزاکت سے شاعر اچھی طرح واقف ہے۔ فلک چھوٹی چھوٹی بحروں میں بھی بڑی بات کہہ گزرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ فن و ادب محض لفظی بازی گری کا نام نہیں۔ ادب وہی ہے جو پوری فن کاری کے ساتھ حیات وکائنات کی ترجمانی کرے اور آدمی کو انسانیت کے ساتھ جینے کا

سلیقہ سکھائے۔

بعض انسانیت پر شاعر کی گرفت مضبوط ہے۔ اسے خبر ہے کہ دلوں کو ہم زبان اور ہم خیال بنانے کے لیے کب اور کیسا حربہ اختیار کرنا چاہیے۔ مذہب کے نام پر اجتماعیت کے وقار کو رسوا کرنے والے سے مخاطب ہو کر شاعر انھیں عالم انسانیت کی بقا کا درس دیتا ہے کہ قدم قدم پر عبادت گاہیں بنانے سے بہتر ہے کہ اپنے دل کے عبادت خانے کو زندہ و آباد کرو، خوش گمانی یا بدگمانی تو یہیں سے پیدا ہوتی ہے:

قدم قدم پہ ملی ہے تری عبادت گاہ
قدم قدم پہ ترا دین بدگماں سا لگا

"حسنِ نظر" کے ہر صفحے پر کچھ اشعار ایسے ضرور ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور معنی کے مختلف جہات کی طرف سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذیل کے اشعار دیکھیے:

سکون، رشک سے جلتا ہوا مکاں سا لگا
یقین، خوف سے اٹھتا ہوا دھواں سا لگا

ایک آہٹ کا منتظر ہوں میں
عہد و پیماں تو کچھ نہیں پھر بھی

بس قریبِ لطفِ غافل ہے فلک یہ کائنات
ہے پسِ مژگاں لہو، رنگِ حنا کچھ بھی نہیں

سجدے سے فلک آخر
ملتا تو خدا کیوں کر

اس مجموعے میں شامل نظمیں، غزلیں اور قطعات تینوں اصناف میں ایک حرفِ مشترک "انسانیت کی تلاش" ہے۔ اس تلاش و جستجو کی جہات مختلف ہیں۔ درد، تلاش، احساس، کیسے ہو تم، گم گشتگی، گیلی عبارت، انکار، وعدہ شکن، صدائے عرفان اور بصیرت اس مجموعے کی خوب صورت نظمیں ہیں۔ درد، جو اُجالوں کی سیہ کاری سے گھبرا کر رات کے پچھلے پہر ہماری ہر دھڑکن میں وفا کا بھرم ڈھونڈنے چلا آتا ہے۔ ایسے میں شاعر کی ہماری نبضِ ناتواں کو ٹٹولنے کی سعی تحیر انگیز بھی ہے اور مسرّت آگیں بھی۔ شاعر نے چراغ، دھواں، رات، تنہائی، درد اور امید و سحر جیسی علامتوں سے حسنِ معنی کو آراستہ کیا ہے اور وسعت بخشی ہے۔ "حسنِ نظر" فلک کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ اس مجموعے کے مطالعے کے بعد یہ بات وثوق کہی جاسکتی ہے کہ فلک کے اندر اچھی شاعری کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔

□□□

ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پر زور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت: -/300 روپے

آندھی (منظرنامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظرنامہ ایک نئی صنفِ ادب ہے۔ اسے عصری پیکروں کا ایک سلسلہ کہا جاسکتا ہے جو کہانی کا روپ دھارن کرلے۔ فلم "آندھی" کا یہ منظرنامہ کملیشور کے ناول "کالی آندھی" پر مبنی ہے اور اس کا اسکرین پلے، مکالمے اور گیت گلزار کے قلم سے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ عمومی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا لیکن اس کی اشاعت کا ایک مقصد ان طلبا اور طالبات کی رہنمائی بھی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کے خواہش مند ہیں۔

صفحات: 122، قیمت: -/65 روپے

تاریخ اور سماجیات

مصنفہ: عائشہ بیگم

تاریخ اور سماجیات، علم کے دو مختلف گوشے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ کا سب سے قریبی تعلق سماجیات سے ہے کیونکہ دونوں کا موضوع انسان، اس کا طرزِ عمل اور کردار ہیں۔ انسانی کردار کی داستان اس کے اخلاق و عمل اور آپسی تعلقات کی داستان ہے اور اخلاق و عمل کا انحصار بڑی حد تک ماضی کے تجربات پر بھی ہوتا ہے — اس کتاب میں اس اہم بحث کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ طرزِ بیان استدلالی اور علمی ہے۔

صفحات: 140، قیمت: 51 روپے

جدید سیاسی فکر

مصنف: ڈاکٹر سید انوار الحق حقی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

اس کتاب میں جدید سیاسی فکر کے پس منظر کے ساتھ ساتھ ان تمام سیاسی فلسفوں پر گفتگو کی گئی ہے جنھوں نے اس مدت میں عالمی سیاست پر اثر ڈالا اور مختلف حکومتی نظاموں کی تشکیل یا استرداد دونوں کا موجب بنے۔ قدامت پسندی، افادہ پسندی، عینیت، ثبوتیت، قانونیت، اشتراکیت اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، سیاسی تکثیریت، مملکت مخالف نظریات، جمہوریت مخالف نظریات، مہاتما گاندھی کا عدم تشدد کا نظریہ اور سرودیہ تحریک — یہ کتاب ان تمام عنوانات پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے۔

صفحات: 305، قیمت: -/120 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: سنتھنی گووندن
بچوں کا گوشہ
مترجم: پروفیسر ظفر احمد نظامی

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں کونسل کی شائع کردہ کتاب "کمسنی کی کہانیاں" سے ایک کہانی پیش کی جارہی ہے۔اس کتاب میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو موضوع بنایا گیا ہے جن کی وجہ سے کم عمر بچے پریشان ہوجاتے ہیں۔ اگرچہ ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ان کہانیوں کے ذریعے بچوں کی تفریح بھی ہوگی اور درس بھی حاصل ہوگا۔ پریشان کن داغ، دوہرے نغمے، یہ کس کا کام ہے، پیار آہی گیا، دہری مشکل، بڑا ہونا، پُل، میری دوسری ماں اور بڑھتے ہوئے درد ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ سدھا سنجیو کی مرتب کردہ 80صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف 35 روپے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

پریشان کن داغ

ناشتہ پر اکیلا کی ممی نے خبر سنائی کہ ''دیوالی کی چھٹیوں میں کچھ مہمان ہمارے ساتھ قیام کرنے کی غرض سے آرہے ہیں۔'' اور مسرور کن انداز میں پوچھا ''اکیلا کیا تم اندازہ کرسکتی ہو کہ وہ کون ہیں؟''

''مم......مم'' اکیلا نے اپنے پاپا کے اخبار کے آخری صفحے پر جھک کر نظر ڈال کر بے خیالی میں اپنے ٹوسٹ کو چباتے ہوئے کہا۔

اسے بڑی حیرت تھی کہ اتنے سارے چچاؤں، چچیوں، ماموؤں، ممانیوں اور رشتے کے بھائیوں میں سے آخر کون ایسے لوگ تھے جو اس بار ان کے یہاں نازل ہونے والے تھے۔

''یہ انکل ارون اور آنٹی برنڈا ہیں جو ہیوسٹن سے آرہے ہیں۔'' اس کی ممی نے بتایا اور پھر ایک ڈرامائی وقفے کے بعد کہا کہ ''ان کے ساتھ سُجے بھی آرہا ہے۔ ذرا سوچو کہ ایک زمانے کے بعد تمھیں اپنے بچپن کے دوست سے مل کر کتنا اچھا لگے گا......''

''اکیلا اپنی کرسی پر سیدھی بیٹھ گئی، اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔'' ان کے آنے کے امید کب تک ہے ممی؟' اس نے پوچھا وہ صبح کی سستی سے پوری طرح بیدار ہوچکی تھی۔

وہ لوگ ایک مہینے کے اندر اندر یہاں آئیں گے تب تک تمھارے امتحانات بھی ختم ہوجائیں گے۔ اس لیے تم پوری طرح اس کا لطف اٹھا سکوگی۔ لو یہ برنڈا آنٹی کا خط پڑھو' اس کی ممی نے کہا۔

خط ہاتھ میں لیتے ہوئے اکیلا خوشی خوشی مسکرانے لگی۔ اس کے ذہن میں سجے کے ساتھ بہت سی خوشگوار یادیں جاگ پڑی تھیں۔

انکل ارون اور اکیلا کے پاپا کالج میں ہم جماعت رہ چکے تھے۔ بعدازاں ان دونوں کو ممبئی میں ملازمت مل گئی۔ شادی کے بعد یہ

بھی ایک خوشگوار اتفاق ہی تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی بن گئے۔ اکیلا اور سجے ہم عمر تھے اور دونوں کی دلچسپیاں بھی یکساں تھیں۔ انھیں میدانی کھیل اور جانور پسند تھے اور دونوں تیرنے اور ٹینس کھیلنے کے لیے بھی ساتھ ساتھ ہی جایا کرتے تھے۔ دونوں ہی پالتو جانوروں کو اپنے اپنے گھروں میں پالنا چاہتے تھے لیکن اپنے والدین کو اس سلسلے میں منانے میں کم نصیب ثابت ہوئے تھے۔ تاہم وہ ناامید نہیں ہوئے تھے اور برسوں انھوں نے کئی مرتبہ ایک بلی، ایک کتے اور سڑک پر پڑے ہوئے ایک زخمی پرندے کو پالنے کی پوری کوشش کی تھی۔ انھوں نے اپنے ہوم ورک، اپنی کامکس کی کتابوں اور اسکر وں میں بھی حصے داری کی تھی اور ایک دوسرے کی سالگرہ کو بھی پارٹیوں میں ساتھ ساتھ منایا تھا۔ انھوں نے بحث ومباحثے بھی کیے تھے اور بری طرح آپس میں لڑے بھی تھے لیکن وہ بہترین دوستوں کی ہی طرح رہے تھے۔

اور جب اکیلا اور سجے تقریباً گیارہ برس کی عمر کو پہنچے تو انکل ارُدن کو امریکہ منتقل ہونے کا موقع مل گیا۔ اکیلا کو یاد آیا کہ جب سجے نے اسے یہ خبر سنائی تھی تو وہ اس قدر حیرت زدہ ہوئی کہ اسے یقین ہی نہیں آیا۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا اور چھے مہینے کی مدت کے اندر اندر سجے اور اس کے کنبے کے لوگ ہیوسٹن منتقل ہوگئے تھے۔

یہ پانچ سال پہلے کی بات تھی۔ اگرچہ دونوں خاندان کے افراد خط وکتابت اور بعض اوقات کرسمس کے کارڈوں کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کیے رہے لیکن اس سلسلے میں وہ پڑوسیوں کی سی بات نہ تھی۔

اپنے خط میں آنٹی برنڈا نے سجے کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں لکھا تھا۔ اس لیے خط کو تہہ کرتے ہوئے اکیلا نے سوچا کہ اتنا وقت گزر جانے کے بعد سجے سے مل کر اسے لگے گا وہ امریکہ جانے سے پہلے کی طرح چیزوں کو پسند کرے گا یا وہ ایک بدلا ہوا شخص ہو چکا ہوگا۔

اکیلا نے سوچا کہ پچھلے پانچ برسوں میں وہ خود کتنی بدل گئی تھی۔ کامکوں اور اسکر وں کے ساتھ ہی اس نے اپنی چوٹیوں اور قسموں سے آگے نکل کر اب وہ ایک حوصلہ مند جرنلسٹ بن گئی تھی۔ وہ اب بھی جانوروں کو چاہتی تھی اور ایک جانوروں کے گھر میں جزوقتی کام بھی کرتی تھی۔ اپنے آپ سے بے پروا ہوکر کہ ایک بار وہ ٹامبے بھی جا چکی تھی لیکن اب ایک تیز طرار لڑکی بن گئی تھی۔ اس لیے اب وہ اپنے پرانے دوست پر پہلے سے زیادہ اچھا تاثر قائم کرنا چاہتی تھی۔

اگلے دو ہفتوں کے دوران اکیلا اپنی پڑھائی میں معروف رہی۔ امتحانات سے فراغت پاکر اس نے اپنے بال ترشوانے اور کچھ نئے کپڑے خریدنے کا پروگرام بنایا۔

امتحان کے آخری دن جب اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو اسے اپنی ناک پر ایک مہاسہ نظر آیا۔ لیکن وہ مہاسہ بہت بڑا نہیں تھا۔ دراصل یہ ایک چھوٹا سا خفیف سا نقطہ سا تھا لیکن اکیلا جس کا زندگی میں کبھی مہاسے سے واسطہ نہیں پڑا تھا شدید طور پر صدمے سے دوچار ہوگئی۔ اس نے سوچا یہ تو اس کے پروگرام میں شامل نہ تھا۔

اس نے اسے غور سے دیکھا اور کئی بار اپنے چہرے کو دھویا اور ہر بار صابن سے دھوکر صاف کیا۔ لیکن اس سخت رگڑ کا ذرا سا اثر بھی

مہاسہ پر نہیں پڑا۔ بلکہ غائب ہونے کے بجائے وہ سرخ ہوکر اور نمایاں ہوگیا۔ دن بھر وہ مہاسہ اس کے ذہن سے محو نہ ہوسکا۔ جب وہ امتحان میں اپنا پرچہ لکھ رہی تھی تب بھی اس کی انگلیاں کئی بار اس مہاسے کو چھوتی رہیں۔

اس نے اسے بری طرح رگڑا۔ شام تک اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ خاصا سوج گیا تھا۔ وہ اک سرخ پھنسی کی شکل اختیار کرگیا تھا اور صاف نظر آنے لگا تھا۔

اکیلا نے اپنے بہت سے دوستوں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے اس سے نجات پانے کے لیے اسے بہت سے گھریلو نسخے بتائے۔ ٹوتھ پیسٹ، بیسن، ہلدی کا سفوف، ان سب کو ملا کر ایک لیپ تیار کرکے مہاسہ پر گاڑھا گاڑھا لگایا جائے۔ اکیلا نے بڑی ایمانداری کے ساتھ اس لیپ کو مہاسے پر تھوپا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ دراصل مہاسہ ابھر کر چھوٹے چھوٹے مہاسوں کا ایک گچھا بن کر اکیلا کی ناک پر پھیل گیا۔

اکیلا کو مہاسوں کے اس گچھے نے دہشت ناک کردیا۔ ایک مہاسہ برا ضرور تھا لیکن یہ پورا گچھا تو تباہ کن تھا۔ اکیلا کو یقین ہوگیا کہ وہ بڑی وحشت ناک اور بدصورت نظر آنے لگی ہے۔ یہ سوچتے ہی وہ پریشان ہوگئی۔ یہ خیال اور بھی مایوس کن تھا کہ یہ پریشانی ایک ایسے وقت رونما ہورہی تھی جب وہ اپنے اس بہترین دوست سے ملنے والی تھی جو ان کے یہاں آنے والا تھا۔ اپنے بال ترشوانے اور نئے کپڑوں کو خریدنے کے لیے اس کا جوش مدھم پڑ گیا۔ جب اس کی ممی نے گھر میں اسے فکر مند ہوکر ادھر اُدھر ٹہلتے دیکھا تو انھوں نے اس سلسلے میں بات کی۔

''مہاسوں پر ہی دنیا ختم نہیں ہوجاتی۔'' انھوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''انھیں تو کوئی دیکھتا بھی نہیں۔ اکیلا اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایشور کے لیے خوش رہو۔ کوئی فکر میں اتنا بدل کر رہ جاتا ہے، جتنا تم بدل کر رہ گئی ہو؟'' لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اکیلا اپنے ذہن سے ان مہاسوں کو جھٹک نہیں سکی۔ انھوں نے اس کے خیالات کو ہر گھڑی پریشان کیے رکھا۔ اس نے آئینہ میں انھیں گھنٹوں غور سے دیکھا۔ جب وہ گھر سے باہر گئی تو وہ بری طرح سیلف کانشس تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے ہر شخص اسے گھور رہا ہو۔ پریشان ہوکر اس کی ممی اسے جلد کے امراض کے ایک ماہر کے پاس لے گئی۔

ڈاکٹر نے ہمدردی کے ساتھ مسئلے کو سنا، اس نے اکیلا کے مہاسوں بھری ناک کا سنجیدگی سے معائنہ کیا تو اس کی ممی نے ناراضگی بھرے لہجے میں کہا۔

''اکیلا پر کچھ زیادہ ہی اس کا ردعمل ہوا ہے۔ یہ طبی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اسے آپ کے پاس لے آؤں تاکہ آپ اسے کوئی معقول مشورہ دے سکیں!''۔

اکیلا کے اظہار پریشانی پر ڈاکٹر مسکرایا۔ اس نے کہا ''تمھارا مسئلہ عام سی چیز ہے۔ اور تمھارا معاملہ تو بالکل معمولی ہے۔''

''آپ اسے معمولی کہتے ہیں؟'' اکیلا نے تلخی سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے کہا۔

''اوہ! یہی تمھارے مسئلہ کا سب سے بڑا سبب ہے'' ڈاکٹر نے فوراً کہا۔ ''تم مہاسوں کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ۔ ایسا کرنے سے جراثیم پھیل جاتے ہیں اور حالت کو بدترین کر دیتے ہیں۔ میں تمھیں ایک صلاح تجویز کرتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ پانی پیو اور پتیوں والی سبزیاں اور پھل کھاؤ، مٹھائیوں اور تلی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرو۔''

اکیلا تڑپ کر رہ گئی۔ اسے سموسے، آلو کے چپس اور مسالے والی چاٹ بہت پسند تھی لیکن اگر اس کا مطلب اسے مہاسوں سے نجات دلانا تھا تو وہ ان سب کو بھی چھوڑ دینے کے لیے تیار تھی۔

''میں تمھیں ایک مرہم بھی دے رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا ''رات کو سونے سے پہلے اسے اپنے چہرہ پر مل لیا کرنا......۔''

''اور میرے یہ مہاسے کب ختم ہوں گے؟'' اکیلا نے پوچھا۔

''یہ ایک ہفتے سے زیادہ نہیں لیں گے؟''

'' آپ کو معلوم ہے! ہمارے یہاں مہمان آنے والے ہیں.....''

''دیکھو اور انتظار کرو.....'' ڈاکر نے کہا۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ فکر مندی مہاسوں میں اضافہ کر دیتی ہے......۔''

اگلے ہفتے اکیلا نے ڈاکٹر کی ہدایات پر سختی سے عمل کیا۔ جب اس کی سہیلیاں کوک پیتی رہتی تھیں تو وہ کچا سلاد اور پالک کھاتی رہتی تھی۔ پابندی سے کریم ملتی تھی اور ایک بار بھی اپنے چہرے کو چھوتی نہیں تھی! اس نے مہاسوں کے بارے میں فکر مند نہ ہونے کی کوشش بھی کی لیکن ڈاکٹر کی اس ہدایت پر عمل کرنا بڑا مشکل کام ثابت ہوا۔ بجے سے ملاقات کے خیال نے اسے خوشی سے پُر کر دیا تھا لیکن اسے یہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ کہیں یہ مہاسے اس موقع پر حارج نہ ہوں۔

پورا ہفتہ پر لگا کر اُڑ گیا اور مہمانوں کے آنے میں کچھ ہی دن باقی رہ گئے۔ سختی سے علاج کروانے کے باوجود اکیلا کے چہرے کے داغ بدستور موجود رہے اور اسے اس حقیقت کا یقین ہو گیا کہ بجے کی آمد کے وقت بھی وہ باقی رہیں گے۔

آخر کار وہ دن بھی آ ہی پہنچا جب اکیلا اپنے پاپا کے ساتھ مہمانوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے ایئرپورٹ جا رہی تھی۔ اس نے بڑے سلیقے سے لباس زیب تن کیا، احتیاط سے اپنے چہرے پر میک اپ کیا اور جس قدر ممکن تھا، اپنے مہاسوں کو چھپانے کی کوشش کی۔ آئینے میں اپنے اوپر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس نے خود کو یہ اطمینان دلا دیا کہ وہ بری نظر نہیں آ رہی ہے۔

ایئرپورٹ پر اکیلا نے جلدی ہی انکل اروِن اور آنٹی برنڈا کی شکلوں کو پہچان لیا لیکن اس کے ساتھ دراز قد اور چوڑے کاندھوں والے اجنبی کو دیکھ کر سوچنے لگی کیا وہ بجے ہو سکتا ہے؟ وہ سیدھا اپنی پرانی دوست کے پاس پہنچا اور اس کا ہاتھ تھام لیا اور جب سیلف کانشس اکیلا نے اس کی ہنستی ہوئی آنکھوں میں جھانکا تو بے یقینی کے عالم میں ایک لمبی سانس کھینچی۔

کیوں کہ اس کی ناک اور گالوں پر مہاسوں کی ایک فصل اُگی ہوئی تھی۔

□□□

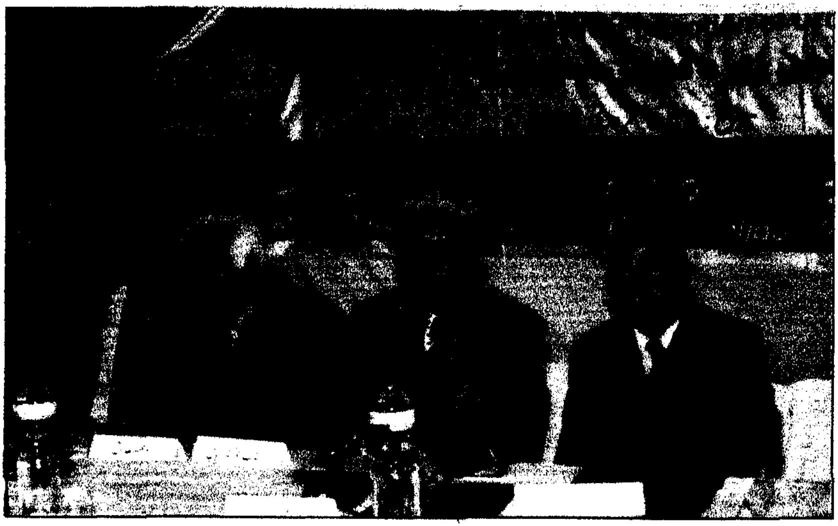

سمنار میں "ترقی پسند فکر اور سیکولر جمہوری روایات" کے زیرِ عنوان اجلاس کی مجلسِ صدارت میں (دائیں سے) جناب بلراج پوری، پروفیسر علی احمد فاطمی، جناب جوگندر پال اور پروفیسر صادق تشریف فرما ہیں۔

اختتامی تقریب کے موقعے پر لی گئی سامعین کی ایک تصویر۔ پہلی قطار میں (دائیں سے) جناب فہیم فیضی، جناب اے۔ کے۔ ہنگل، جناب مظہر امام، جناب مظہر شہاب، جناب مدن گوپال، جناب سید شاہد مہدی، پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر نسیم احمد خاں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

URDU DUNIYA **Monthly, March 2005, Vol. 7, Issue: 3**
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

ممتاز فلم ہدایت کار، شاعر اور ادیب جناب گلزار کے مشہور ٹی وی سیریل "مرزا غالب" کا منظرنامہ انگریزی میں "مرزا غالب — اے بایوگرافیکل سینیریو" کے نام سے شائع ہوا ہے۔
اس کا اجرا 8 جنوری 2005 کو آکسفورڈ بک اسٹال، بارہ کھمبا روڈ، نئی دہلی میں ہوا۔ یہ کتاب روپا اینڈ کمپنی نے شائع کی ہے جس کا اردو ترجمہ قومی اردو کونسل نے
روپا اینڈ کمپنی کے اشتراک سے شائع کیا ہے۔ اس تقریب میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے بحیثیت مہمان اعزازی شرکت کی۔ اس موقعے پر لی گئی ایک یادگار تصویر۔

قومی اردو کونسل کی طرف سے منعقدہ تین روزہ سمینار "مشترکہ ہندستانی تہذیب کی تعمیر: سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی خدمات" کے دوسرے دن کے پہلے
اجلاس میں جناب جمال بھارتی کے مرتب کردہ "گلدستہ" کا اجرا، جو احمد علی مرحوم کے منتخب کردہ اشعار پر مشتمل ہے، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کے ہاتھوں عمل میں آیا۔
اس موقعے پر تصویر میں دائیں سے جناب جمال بھارتی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور مرحوم احمد علی کی پوتی گل رعنا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers,
Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066,
Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel : 26103381, 26103938